الصفا اجلاس عام نمبر

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

حیات نو

جلد پانچ

اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

Rs. 50/-

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

آٹھواں اجلاس عام نمبر

مدیر: زبیر ملک فلاحی

مجلس ادارت:

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ڈاکٹر عبد الباری فلاحی	دہلی
شمس احمد مدنی فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ :	اندرون ملک	۳۰ روپے
	بیرون ملک	۵ امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون :	اندرون ملک	۱۲۰ روپے
	بیرون ملک	۲۰ امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ :	اندرون ملک	۳۰۰۰ روپے
	بیرون ملک	۲۰۰ امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

نمائندے

لندن :	رضوان احمد فلاحی
دہلی :	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ :	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی :	حافظ ارحم علی فلاحی
نیپال :	نذر احسن فلاحی
نیا سرائے :	خالد حسن رشید فلاحی
قطر :	محمد اکرم فلاحی
کویت :	محمد سہیل فلاحی
سعودی عرب :	نور اللہ فلاحی

خط و کتابت کے پتے

- برائے ادارتی امور

۲۰۳-اے، آزاد نگر، حسین آباد، لکھنؤ-18

موبائل: +91-9889650087

- برائے انتظامی امور و ترسیل زر

عرفان احمد فلاحی، جامعۃ الفلاح

بلریاگنج، اعظم گڑھ، یوپی-276121

موبائل: +91-9453757380

ای میل: hayatenau120@gmail.com

Designing & Type Setting: Sajid Khalil Falahi

ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح کی مطبوعات

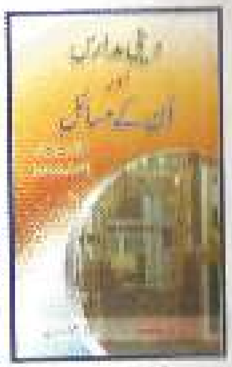

Rs. 75.00

Rs. 40.00

Rs. 100.00

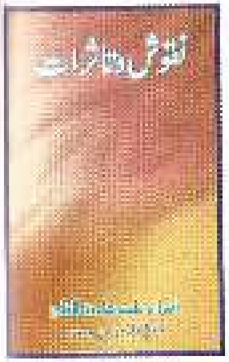

Rs. 15.00

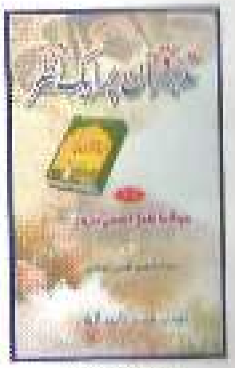

Rs. 70.00

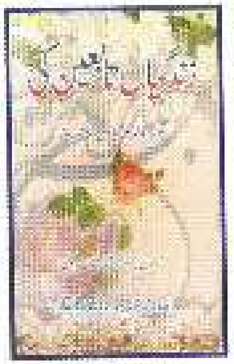

Rs. 80.00

Rs. 100.00

Rs. 45.00

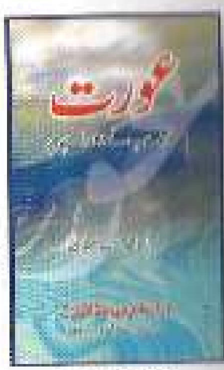

Rs. 45.00

Rs. 100.00

Rs. 100.00

Rs. 120.00

IDARA-E-ILMIA, JAMIATUL FALAH

BILARYA GANJ, AZAMGARH, (U.P) -276121 INDIA

فہرست مضامین

- ترانہ جامعہ 03
- اپنی بات (اداریہ) 05
- استقبالیہ کلمات — زبیر ملک فلاحی 07
- صدارتی کلمات — ڈاکٹر ملک محمد فیصل فلاحی 10
- کلیدی خطاب — مقبول احمد فلاحی 16

مقالات

- اسلام کے فکری مناہج کا جائزہ اور موجودہ مسلم معاشرہ پر ان کے اثرات — مولانا ولی اللہ مجید قاسمی 25
- فقہی مسالک کی حقیقت اور موجودہ حالات میں امت پر ان کے مثبت و منفی اثرات کا جائزہ — شیخ رضاء اللہ عبد الکریم سلفی 34
- اتحاد امت کی بنیادیں...... — مولانا عطاء الرحمٰن وجدی 49
- آزادی کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کے سیاسی تجربے — ایک جائزہ — پروفیسر حسن رضا 55
- ہندستانی سیاست اور مسلمان — پروفیسر منظور احمد 59
- کیا ہمارے علماء موجودہ سیاسی قیادت کا خلاء پر کر سکتے ہیں؟ — مولانا سلطان احمد اصلاحی 65
- مسلم معاشرے میں طبقاتی امتیازات ایک تجزیاتی مطالعہ — ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی 90
- مسلم معاشرہ کے مسائل اور اس کے اسباب — مولانا طاہر مدنی 109
- رپورٹ — انجمن طلبۂ قدیم — ڈاکٹر عبد الباری فلاحی 113
- مختصر رپورٹ — آٹھواں اجلاس عام و سمینار — ڈاکٹر عبد الباری فلاحی 121
- قراردادیں 125
- جامعہ کے گل و نہار — عبد الرقیب فلاحی 130

ترانۂ جامعہ

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح
ہے ہمارے بھی اونچا سرا مینار فلاح

اے کہ ذروں میں ترے بوئے یقیں ذوق سجود
ہے تو انجمن تری صحرا ہوں پہ انوار وجود
مفت ہاتھ آئے ہیں مستوں کو یہاں جام شہود
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

ناز ہے ہم کو کہ ہم تیرے جگر بند ہوئے
اہل صفہ کی طرح ہم بھی برومند ہوئے
سادگی اور قناعت پہ رضا مند ہوئے
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

کتنی رعنائیاں تیرے خس وخاشاک میں ہیں
ریزے الماس و گہر کے جو تیری خاک میں ہیں
بجلیاں ایسی کہاں گنبد افلاک میں ہیں
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

روشنی ہم کو ملی ہے تری قندیلوں سے
آگہی ہم کو ملی ہے ترے جبریلوں سے
زندگی ہم کو ملی ہے ترے مندیلوں سے
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

تری کلیوں کی بشاشت ترے پھولوں کا نکھار
تری شاخوں کی لچک اور ترے غنچوں کا وقار
نقش ہے دل پہ ترا پیکر گل روئے نگار
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

تیشۂ جہد و عمل تجھ سے چلانا سیکھا
پرچم حسن عمل تجھ سے اٹھانا سیکھا
کوہ نخوت کو بھی ٹھوکر سے گرانا سیکھا
ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

تیرے کوزوں میں نہاں ہم نے سمندر پایا
تیرے ذروں میں جمال مہ و اختر پایا
تیرے ویرانے میں اک پھولوں کا لشکر پایا

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

ذہن شاداب ہوا عقل کو برنائی ملی
دل کو شائستگی انجمن آرائی ملی
دست و بازو کو یہاں قوت صحرائی ملی

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

تیرے کانٹوں سے لیا درس تمنا ہم نے
تیرے قطروں سے سنی قرأت دریا ہم نے
تیرے ذروں میں پڑھی آیت صحرا ہم نے

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

یاد فردوس کی آئے وہ فضا تیری ہے
دل میں طوفان اٹھائے وہ ہوا تیری ہے
ہے یہ تکبیر مسلسل کہ صدا تیری ہے

ہم ہیں پروانے ترے شمع ضیا بار فلاح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

اپنی بات

زبیر ملک فلاحی

حیات نو کی اشاعت تو مبارک ہو۔ ہم اس موقع پر بارگاہ الہی میں سجدہ شکر بجالاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالی اس فیصلے کو باعث خیر و برکت بنائے اور شر و رفتن سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

حیات نو کی اشاعت تو جہاں باعث شکر گزاری رب ہے وہیں اس کے تقاضے بھی نہایت اہم ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس کا خریدار بننا ہوگا اور جہاں تک ممکن ہو اس کا دائرہ وسیع کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کوئی رسالہ صرف خریداروں کی بنیاد پر نہیں چلتا۔ اس کے لئے اشتہارات بھی لازمی ہوتے ہیں۔ حیات نو چونکہ ابھی شروع کیا گیا ہے اس لئے تمام احباب کو اپنے حلقہ تعارف میں اس کے لئے اشتہارات، سالانہ ممبر شپ اور لائف ممبر شپ کی کوشش کرنی ہوگی۔

اسی طرح فلاحی اہل قلم احباب سے میری گزارش ہے کہ حیات نو کو سامنے رکھ کر مضامین تحریر فرمائیں اور ارسال فرمائیں۔

حیات نو فلاحی برادران کی امنگوں، آرزوں اور ان کے خیالات و احساسات کا عکاس ہے، میری تمام احباب سے گزارش ہے کہ اسے بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اپنی قیمتی آراء، تجاویز اور مشوروں سے بے دریغ نوازیں۔ سب کا خیر مقدم ہے۔

اس شمارے میں انجمن کے آٹھویں اجلاس کے موقع پر منعقد سیمینار میں پڑھے گئے مقالات شائع کئے جا رہے ہیں۔ مقالات کا علمی، فکری پہلو سے اہم اور مفید ہونا ایک بات ہے۔ ہم فلاحیوں کے لئے یہ اس پہلو سے یادگار ہیں کہ دس سالہ جمود و تعطل کے بعد انجمن پھر سے زندہ اور فعال ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ آٹھواں اجلاس عام فلاحی برادری کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

عالمی منظرنامے پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ان اجتماعیتوں کو ختم کیا جا رہا ہے جو آئندہ کسی بھی اعتبار سے مستکبرین کے منصوبوں میں رخنہ ڈال سکتی ہیں اور علمی، فکری اور عملی کسی بھی پہلو سے ان کو چیلنج کر سکتی ہیں۔ بلکہ اندازہ تو یہ ہے کہ حکومتوں، تنظیموں، اداروں سے آگے بڑھ کر افراد بھی ناقابل برداشت ہونے والے ہیں .... ایسے پرآشوب ماحول میں انجمن کی غیر حاضری، عدم فعالیت اور

انجماد اپنے فکری ورثہ اور نظریاتی اساس سے بے ایمانی کی بات ہے۔ ایمانداروں کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب مصائب اور مشکلات کو سامنے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے اسی کی پیشین گوئی کی تھی اور اس طرح ان کا ایمان اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بے پناہ اجر سے نوازے ان فلاحی بھائیوں کو جن کی کوششوں سے یہ تعطل ختم ہوا۔

الحمدللہ جواں عزائم، بلند حوصلوں اور پختہ شعور کے ساتھ ہمارا کارواں پھر سے جادہ پیما ہوا ہے۔ آپ بھی قدم سے قدم ملائیے اور یہ احساس رکھئے کہ مبادا آپ کی سست روی وجہ دوری منزل نہ بن جائے۔ فی امان اللہ۔

☆☆☆

غزل

رہ حیات کی کھوئی ہوئی صدا بن جائے
ہجوم غم میں کوئی ہو جو آسرا بن جائے

یہ کاروان محبت ہے اے خرد مندو
سمندروں سے بھی گذرے تو راستہ بن جائے

زباں پہ ذکر اسی کا ہو روز و شب کیونکر
نہ چاہئے اسے اتنا کہ وہ خدا بن جائے

پھر اسکے بعد سخن تیرا معتبر ہوگا
تراش سنگ کچھ ایسے کہ آئینہ بن جائے

الجھ کے رہ سا گیا ہوں ترے خیالوں میں
کہ اک خیال مٹاؤں تو دوسرا بن جائے

حذر کہ اشک نہ چھلکے نگاہ سے انور
رخ ستم نہ کہیں درد آشنا بن جائے

ڈاکٹر نعمان انور فلاحی (جامعہ ہمدرد)

استقبالیہ کلمات

زبیر ملک فلاحی
(معاون ناظم اجلاس)

الحمد للہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین الی یوم الدین۔ اما بعد

جناب صدر اور جملہ ذمہ داران انجمن واجلاس عام نیز فلاحی برادران!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رہروو! جشن کہ منزل کے نشاں ابھرے ہیں
میکشو! رقص کہ میخانہ نظر آیا ہے
غیرِ وحدت حق تیری تجلی کے نثار
اپنے اندر کا صنم خانہ نظر آیا ہے

اس آٹھویں اجلاس عام میں ہم تمام احباب کا دل کی گہرائیوں سے استقبال کرتے ہیں۔

برادران محترم! حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سب مل کر انجمن بناتے ہیں، انجمن ہماری ہے، ہمیں سب اس کے کرتا دھرتا ہیں، ہمیں استقبال کرنے والے اور ہمارا ہی استقبال ہو رہا ہے گویا خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ۔ بصد احترام گزارش ہے کہ آپ حضرات مجھے یہ تعبیر اختیار کرنے کی اجازت دیں کہ ہم سب ایک دوسرے کو والہانہ انداز میں خوش آمدید کہتے ہیں اور آٹھویں اجلاس عام کے انعقاد پر اپنی بے پایاں مسرتوں کا اظہار کرتے ہیں اور اس خوشی کے موقع پر بارگاہ الٰہی میں سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔

محترم حضرات! کم و بیش دس سال کے عرصے کے بعد ہم سب اکٹھا ہوئے ہیں۔ آج جب کہ انقلابات کا سلسلہ پیہم جاری ہے۔ تبدیلیاں جنہیں ایک طویل مدت درکار ہوتی تھی آج پلک جھپکتے واقع ہو رہی ہیں۔ فضا کی ہواؤں اور کرنوں کی دوش پر سوار ہو کر زمانے میں تغیرات کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ ایسے تیز رفتار زمانہ میں دس سال کا عرصہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ اس جمود و تعطل کے دس سال میں اگر ہم رفتار زمانہ کا ساتھ دیتے ہوئے متحرک اور فعال ہوتے تو ہماری جامعہ، ہماری انجمن اور بذات خود ہم کہاں پہونچ گئے ہوتے؟

اس جمود و تعطل کو توڑنے میں جن حضرات نے کسی طور پر جدو جہد کی ہے ہم انھیں سلام کرتے ہیں اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس کا بہتر اجر عطا فرمائے۔

اس شکر گزاری کا لازمی تقاضہ ہے کہ ہم میں کا ہر فرد اپنے گریبان میں سر ڈال کر سوچے اور عہد کرے کہ آئندہ اس کی طرف سے اس اجتماعیت کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔

محترم حضرات! آج جب کہ اجتماعیتیں وقتی مفادات، جغرافیائی، لسانی، مسلکی و گروہی عصبیتوں کی بنا پر قائم ہو رہی ہیں آپ کی قائم کردہ اجتماعیت جسے ہم انجمن طلبہ قدیم کے نام سے موسوم کرتے ہیں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل ہے۔ یہ انجمن ہر قسم کی عصبیت سے الحمد للہ پاک ہے۔ ہمارا ملنا بچھڑنا، بچھڑ کر پھر ملنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔

آج جب کہ اونچ نیچ، ذات پات، رنگ و نسل، زبان و وطن جماعتی و گروہی تعصبات نے معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے آپ کی آفاقیت کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ ہمیں اس کا تحفظ کرنا چاہئے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کو راسخ اور مستحکم کرنا چاہئے اور زمانہ کے سامنے بطور مثال اور نمونہ آنا چاہئے جس طرح یہ حقیقت ہے کہ زمانہ میں اس کی شدید ضرورت ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ضرورت کی تکمیل صرف آپ ہی کر سکتے ہیں اور یہ ذمہ داری سب سے زیادہ آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔

محترم حضرات! یہ سخن سازی نہیں ہے اور نہ ہی آپ کی خوش آمد، کیونکہ یہ واقعہ نہیں ہے کہ آپ نے جامعۃ الفلاح کی فضاؤں میں سانس لی ہے۔ یہاں کے مخلص اور باصلاحیت اساتذہ سے کسب فیض کیا ہے، ایک مدت تک قرآن و حدیث اور دیگر علوم اسلامیہ کو سبقاً سبقاً پڑھا ہے اور اسی کے ساتھ آپ حرکی تصور دین کے حامل ہیں۔ آپ وہ ہیں جن کو صرف نظریات ہی نہیں پڑھائے گئے ہیں بلکہ ان کی عملی مشق بھی کرائی گئی ہے، آپ صرف دین حق کے رمز شناس ہی نہیں باطل کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ آج اس معاشرے میں سب سے زیادہ باشعور اور حساس اجتماعیت صرف آپ کی اجتماعیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ذمہ داریاں بھی سب سے زیادہ ہیں۔ آپ سے توقعات بھی دوسروں سے بڑھ کر ہیں:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

آپ کا تجزئی گرم جوشی کے ساتھ استقبال ہے لیکن اس عزم و ارادہ کے ساتھ کہ آپ اس مشکل کو گلے لگائیں گے اور اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے خود کو پیش کریں گے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
تو ہی ناداں اسے اٹھا لایا

محترم حضرات! یہ آٹھواں اجلاس بانگ رحیل ہے۔ ہمارا قافلہ پھر سے جادہ پیما ہوتا ہے، اللہ اسے منزل مراد تک پہنچائے۔

برادران محترم! آپ مہمان نہیں اپنے گھر آئے ہیں۔ جہاں آپ نے برسوں گزارا ہے، بچپن کی کتنی میٹھی یادیں یہیں سے وابستہ ہیں۔ مادر علمی یعنی یادوں کے اس دبستاں میں آپ کا ورود مبارک ہو۔

انجمن کے ذمہ داروں اور اہل جامعہ نے آپ کے لئے جو تیاریاں کی ہیں ان سے محظوظ ہوئیے اور بے تکلفی کے ماحول میں مزے لوٹیے۔ بھائیو! ہم نے کوشش کی ہے کہ بہتر سے بہتر سہولیات آپ کو فراہم ہوں اس کے باوجود ہمیں احساس ہے کہ شائد آپ کے آرام کے لئے بہت معیاری تیاری نہیں کر سکے ہیں۔ اگر کوئی بھائی ایسا محسوس کریں تو براہ کرم خدام سے رجوع فرمائیں ہماری طرف سے ہر ممکن کوشش ہوگی۔

ایک اہم موضوع پر سیمینار ہو رہا ہے، اس کا عنوان انتہائی اہم ہے، آپ سب سے گزارش ہے کہ بھرپور استفادہ کیجئے اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں فعال شرکت فرمائیے۔

اللہ تعالیٰ آپ کا جامعہ آنا مبارک کرے اور اس کی توفیق دے کہ ہم بار بار یہاں حاضر ہوں جامعہ کا ذرہ ذرہ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

☆☆☆

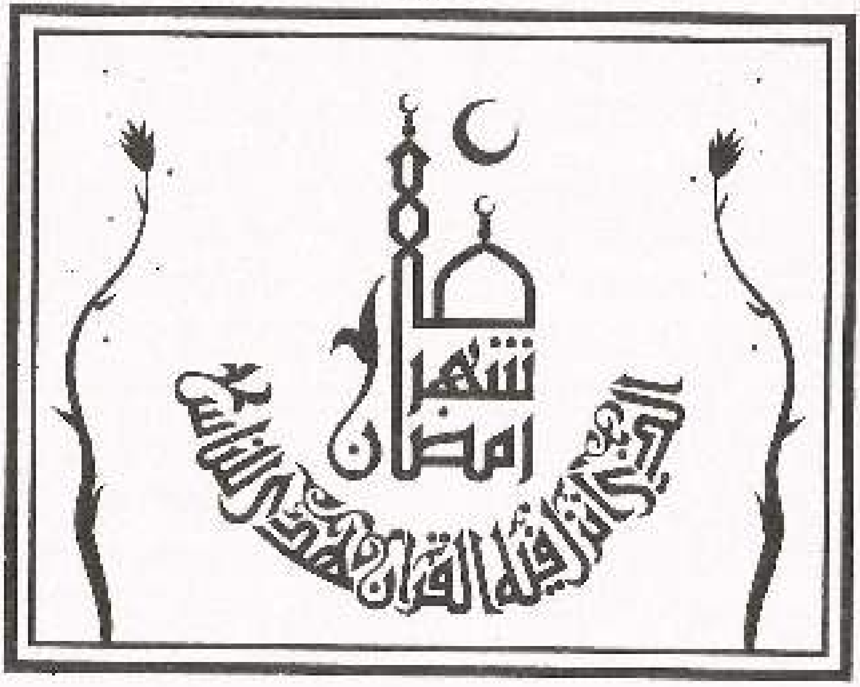

صدارتی کلمات

ڈاکٹر ملک محمد فیصل
(صدر انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح)

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہ و اصحبہ اجمعین: اما بعد
الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ

معزز و مکرم بھائیو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم بہت خوش ہیں اور دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ انجمن طلبہ قدیم کے آٹھویں اجلاس عام میں شریک ہیں اور الحمد للہ اجلاس کا آغاز خیر وخوبی کے ساتھ ہو چکا ہے اور اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ تمام حسن وخوبی کے ساتھ اجلاس نہ صرف اختتام پذیر ہوگا بلکہ انشاء اللہ اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگا۔

برادران محترم! اس موقع پر جامعۃ الفلاح کے مقاصد کا استحضار اس لئے ضروری ہے کہ ہم سب ان مقاصد کی عملی تعبیر ہیں اور انجمن بذات خود انہیں مقاصد کی تکمیل اور عملی زندگی میں ان کی تطبیق کا ایک موثر پلیٹ فارم ہے۔

دستور جامعہ کی دفعہ نمبر ۲ میں اس کے اغراض ومقاصد ان الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں:

جامعہ کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو:

☆ قرآن وسنت کا گہرا علم اور دینی بصیرت رکھتے ہوں۔

☆ جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو اور جو غیر اسلامی افکار ونظریات سے بخوبی واقف ہوں۔

☆ جو اسلامی اخلاق وکردار کے حامل ہوں۔

☆ جن میں احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ ہو۔

☆ جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں۔

☆ اسلام کی خدمت کے لئے دور جدید کے تقاضوں کے مطابق فکری، علمی اور تحقیقی مواد فراہم کرنا۔

بلاشبہ ان مقاصد کا ہم فارغین جامعہ سے مطالبہ ہے کہ:

ہمارا تعلق قرآن وسنت سے زندگی کے ہر مرحلہ میں نہ صرف برقرار رہے بلکہ روز بروز اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ ظاہر ہے دوران قیام جامعہ وہ گہری بصیرت کماحقہ حاصل نہیں ہو سکتی جس کا دستور ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ قرآن وسنت میں گہری بصیرت عملی زندگی ہی میں ممکن ہے کیوں کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کا تعلق عملی زندگی سے ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ اس سلسلہ میں کبھی کوتاہی نہ کریں اور اپنے اوقات کا ایک حصہ ضرور ہر حال میں فارغ رکھیں جس میں قرآن وسنت سے قریب ہو سکیں اور اپنی عملی زندگی کو قرآن وسنت کے آئینے میں استوار کر سکیں۔ قرآن وسنت میں گہری بصیرت کا تعلق فکری ونظری سے زیادہ عملی وانطباقی ہے۔

اسی طرح ہمارے لئے یہ لازم ہے کہ ہم حالات زمانہ سے بخوبی واقف ہوں۔ دنیا کے حالات کیا کروٹ لے رہے ہیں۔ حق وباطل کی کشمکش کس مرحلہ میں ہے باطل پرست قوتیں کن کن ذرائع سے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف صف بستہ ہیں اور اسلام کے خلاف کون کون سی قوتیں کیا کیا حرکتیں کر رہی ہیں اور ان کے عزائم ومنصوبے کیا ہیں اس پر ہماری گہری نظر ہو۔ اگر ہماری آنکھیں کھلی ہوں گی تو خواہ ہم زندگی کے کسی موڑ پر کیسے ہی حالات سے گزر رہے ہوں یہ ممکن نہیں ہے کہ حق وباطل کی نبرد آزمائی اور تعمیر وکاری میں ہمارا کوئی رول نہ ہو یا ہم خاموش تماشائی کی طرح عوام کالانعام کی مانند دنیائے دوں کی لذتوں میں گم ہو کر اپنی منزل اور نصب العین سے غافل ہو جائیں۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے مادر علمی سے کسب فیض کے نتیجہ میں ہماری ذہنی وفکری ساخت کو وہ رخ دے دیا ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والے حالات وتغیرات کو تفقہ فی الدین اور رسوخ فی العلم کی عینک سے دیکھ کر سیاہ وسپید، صحیح وغلط کی تمیز کر سکیں اور وقت وحالات کی پر پیچ راہوں میں صراط مستقیم کی تعیین کر سکیں۔ اللھم وفقنا لھذا۔

حضرات: ہندوستان میں دینی مدارس بے شمار ہیں ہر سال فارغین مدارس اسلامیہ کی ایک بڑی کھیپ علوم دینیہ سے آراستہ ہو کر میدان عمل میں قدم رکھتی ہے۔ ہمیں کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہئے کہ علوم کی گہرائی اور تعمق میں دوسرے مدارس کے فارغین ہم سے آگے ہو سکتے ہیں مگر اللہ کے فضل خاص اور جامعہ سے وابستگی کے نتیجہ میں ہمیں ایک ایسا وزنایاب میسر ہے جو دوسری جگہ کم ہی نظر آتا ہے وہ یہ کہ ہمارے سامنے ایک واضح نصب العین ہے، ہماری زندگی کا مقصد احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔

خدانخواستہ اگر یہ نصب العین اور زندگی کا مقصد ہمیں میسر نہ آتا تو خواہ علمی موشگافیوں اور علمی مباحث میں ہم کتنی بلندی پر کیوں نہ فائز ہو جاتے ایک ایسا خسارہ ہوتا کہ دنیا کی زندگی بے فیض ہوتی اور آخرت میں اپنی زندگی کا حساب دینا مشکل ہو جاتا۔

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا و ما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا اللہ۔

مقصد حیات کا شعور اللہ کی عظیم ترین نعمت ہے ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اس نعمت کی قدر دانی یہ ہے کہ ہم برابر اپنی علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہیں کہ ہماری زندگی کتنی اس مقصد حیات کے تحت گزر رہی ہے اور کتنی غفلت کا شکار ہے۔ مقاصد جامعہ کے استحضار کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہمارا بجا احساس ہے کہ احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جو صحیح جذبہ مادر علمی نے ہمارے اندر پیدا کرنا چاہا ہے بلاشبہ اس میں کمزوری آئی ہے۔

اس میں مادر علمی کو قصور وار ٹھہرانا درست نہیں ہے یہ ہمیں اس کے سپوت ہیں جو نااہلی کا سامان فراہم کر کے اپنے وجود سے مادر علمی کی رسوائی کا سبب بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی ہر طرح کے فتنوں سے حفاظت فرمائے اور نصب العین کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق بخشے۔

انشاء اللہ کل اسی مقام پر ''مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں علماء کا کردار'' کے عنوان پر سمینار ہوگا۔ عنوان کا منظر و پس منظر دیکھئے اور مقاصد جامعہ کی اس شق پر نظر ڈالئے جس میں ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم ہر طرح کی گروہی، مسلکی و جماعتی عصبیتوں سے اوپر اٹھ جائیں اور دنیا کو اسلام اور غیر اسلام کے تناظر میں دیکھ کر اپنے لئے راہ عمل کا تعین کریں، سمینار کے مباحث سے یہ بات سامنے آئے گی کہ ہمارے درمیان اختلافات و انتشار کے اسباب و علل کیا ہیں اور شیرازۂ امت کو مجتمع کرنے کے لئے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر مقاصد جامعہ کے اصولی خاکے میں رنگ بھرنے کی ہمارے اندر صلاحیت ہے تو پھر ہمیں وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

حضرات: مذکورہ بالا احساسات درست ہیں مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ہم وابستگان انجمن یا فارغین جامعہ بھی انسانی سماج کا حصہ ہیں شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور روئے زمین پر اس کی یلغار کا براہ راست ہدف وہ لوگ ہیں جو اس کے ناپاک عزائم و منصوبوں کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتے ہیں غور فرمایئے عصر حاضر میں انسانی آبادی میں اسلام کے ماننے والے مسلمان، پھر مسلمانوں میں وہ لوگ جو دین پسند ہیں اور دین پسندوں میں وہ جن کے سامنے زندگی کا واضح نصب العین ہے جو شیطنت کی سرکوبی اور پرچم حق کی سربلندی کو مقصد حیات بنا کر سرگرم عمل ہیں اور پھر اسی طبقہ کے وہ افراد جو الفقہ فی الدین قرآن و سنت کی گہری بصیرت، اخلاق و کردار سے آراستہ ہیں یہ گویا انسانی آبادی کا وہ حصہ ہے جسے شیطان اور شیطانی قوتوں کا دشمن نمبر ایک کہنا مناسب ہوگا۔ بھلا شیطان ان سے کیسے صرف نظر کر سکتا ہے۔

بلاشبہ اس کے تیز و تند حملے متواتر ہم پر ہو رہے ہیں۔ ان شیطانی حملوں سے اپنی حفاظت خود احتسابی اور اللہ کے تقویٰ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ذرا سی غفلت سے ہمارا دشمن ہم پر قابو پا سکتا ہے اور ہم

پر قابو پانے کا مطلب دنیائے انسانیت کی تباہی و بربادی کے شیطانی ہدف کی تکمیل ہوگا۔

آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ یہ آٹھواں اجلاس عام تقریباً ۱۰ سال کے بعد ہو رہا ہے۔ اس دوران ہونے والے حالات و تغیرات کی تاویل اس کے علاوہ کیا کی جا سکتی ہے کہ شیطانی وساوس کے ہم شکار ہو گئے اور ہماری انجمن کے ذریعہ انجام پانے والے تعمیری کام رک گئے۔

اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں۔ آدمیت کا کمال یہ ہے کہ اپنا احتساب کرے اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس ہمہ دم تازہ رہے تو بہ و استغفار کرے اور آئندہ اللہ کی پناہ لیتے ہوئے زندگی کی تشکیل نو کے لئے کمربستہ ہو جائے۔

ہم صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرتے ہیں اپنی غلط روی سے تائب ہوتے ہیں اور آئندہ کے لئے خلوص نیت کے ساتھ درست سمت میں پیش قدمی کا عزم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ثبات قدمی عطا فرمائے۔

ہم مشکور ہیں ان بزرگوں اور محسنین کے جنہوں نے ہمیں آئینہ دکھایا، ہمیں سمجھایا بجھایا، ہم کو اپنے مقام کی بازیافت کا راستہ بتایا۔ ہمارے دلوں کو جوڑنے اور نصب العین کے لئے متحدہ جد و جہد کرنے پر آمادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں اور ساتھیوں کو جزائے خیر سے نوازے جنہوں نے بے لوث اور انتھک جد و جہد کر کے ہمیں اس لائق بنایا کہ ۱۰ سالہ طویل وقفہ کے بعد آج پھر آٹھویں اجلاس عام میں موجود ہیں اور نئے حوصلوں کے ساتھ اپنا تعمیری کردار ادا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء

برادران عزیز و محترم: انجمن طلبہ قدیم کی تشکیل جدید کے تقریباً دو سال گزر چکے یہ دو سال بھی غیر یقینی کے حالات سے گزرے ہیں۔ اس دوران ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج تنظیم کو ٹھوس بنیادوں پر مستحکم کرنا اور بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کرنا رہا ہے۔ الحمد للہ اس محاذ پر توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ملی ہے اس دوران ہونے والی کوششوں سے اندازہ ہوا کہ ہم میں کا ہر دل درمیان میں رونما ہونے والے حالات و حادثات سے صد درجہ پریشان اور کبیدہ تھا ہر پاک روح ان نامبارک حالات سے نکلنے کے لئے گویا بے تاب تھی اور شاید آپ حضرات کی اسی قلبی کیفیت کا نتیجہ ہے کہ آج انجمن نہ صرف بحال ہے بلکہ نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کے لئے بے تاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حوصلے بلند کرے اور مل جل کر ثبات قدمی کے ساتھ آگے بڑھنے اور بڑھتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اس مختصر مدت کے تجربات سے ہمارے اوپر کئی حقائق منکشف ہوئے ہیں۔ ایک بڑی حقیقت یہ سامنے آئی ہے کہ انجمن طلبہ قدیم کی حیثیت ایک علمی تنظیم کی ہے۔ فارغین جامعہ دنیا کے مختلف حصوں

میں سرگرم عمل ہیں۔ مختلف شعبہ ہائے حیات میں ان کی سرگرمیاں موثر اور نتیجہ خیز ہیں اور بحمد اللہ یہ احباب جہاں کہیں ہیں ایک دوسرے سے رشتۂ اخوت میں بندھے ہوئے ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں تمام فلاحی بھائیوں سے رابطہ ہو اور اس رابطے کے ذریعہ عالمی سطح پر ٹھوس عملی اقدامات کی منصوبہ بندی کی جائے تو بلا شبہ اس تنظیم کی معرفت کارہائے نمایاں انجام دیے جا سکتے ہیں۔

ایسے منصوبے زیر عمل لائے جا سکتے ہیں جو نہ صرف جامعہ اور انجمن کے لئے سود مند ہوں گے بلکہ پوری ملت اور دنیائے انسانیت کے لئے کارگر اور مفید ہوں گے۔ ہماری خواہش ہے کہ آنے والے دنوں میں انجمن کی ٹھوس تنظیم پر توجہ صرف کی جائے اور متعین اہداف کے لئے ایک تسلسل کے ساتھ جد و جہد کی جائے۔ اگر اس رخ پر مناسب انداز سے کام کیا جائے تو انشاء اللہ مستقبل میں اس کے امید افزا اور نفع بخش نتائج سامنے آئیں گے۔

بلا تکلف اس حقیقت کا اظہار کرنا مناسب ہے کہ فارغین جامعہ نے تحریک اسلامی کے لئے ہراول دستہ کے طور پر کام کیا ہے مگر اب رفتہ رفتہ یہ محاذ بھی متاثر ہوتا جا رہا ہے ہم اس کیفیت کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں بہر حال اپنی اس حیثیت کو بحال کرنا ہوگا۔ ہماری خمیر میں اسلام کی خدمت اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ شامل ہے۔ اس جذبہ کی تسکین کے بغیر ہمارا وجود بے معنی ہے۔ لہذا ہم سب جہاں کہیں بھی ہوں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا رخ کیا ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ محسوس ہو کہ ہمارا رول کمزور ہو رہا ہے تو فوری توجہ دے کر حقیقی کردار بحال کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔

ساتھ ہی بجا طور پر ہم امید رکھتے ہیں کہ تحریک اسلامی کے سوچنے سمجھنے والے لوگ اپنے اس سرمایہ کی قدر پہچانیں اور اسے ضائع ہونے سے بچانے کی منصوبہ بندی کریں اور ہماری قوتوں اور صلاحیتوں کے مثبت استعمال کی پلاننگ کریں کیوں کہ جامعہ اور انجمن کا تشخص اسی تحریکی شناخت سے ہے۔ اس شناخت کے مٹ جانے کے بعد ہمارا وجود بے معنی ہوگا۔

ہمارا تیسرا ہدف یہ ہے کہ بدقسمتی سے ابھی تک جامعہ اور ہماری انجمن کی نمایاں علمی شناخت نہیں بن سکی ہے۔ اگرچہ اس تجزیہ سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے تاہم ہمیں اس محاذ پر بھی توجہ دینی ہوگی کہ ہمارے احباب جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف علم قرآن و سنت سے آراستہ فرمایا ہے وہیں دوسری طرف عصری علوم میں بھی ترقی عنایت کی ہے۔ دینی و عصری علوم کے ان حاملین قدیم و جدید پر بجا طور پر از خود یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ زمانے کی الجھنوں کو قرآن و سنت کے ذریعہ سلجھانے کے لئے آگے آئیں آپ مفکر، مدبر، مصنف، مقرر، محقق سب کچھ ہیں اور آپ کی ہمی شناخت کا ماتم کیا جا رہا ہے بہت آسانی کے ساتھ اور بہت جلد اس مسئلہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

آج ضرورت ہے کہ ہمارے ذریعہ ایسے جامع تعلیمی اداروں کا ہر سطح پر سلسلہ قائم ہو، جو تعلیم و تعلم کے پاکیزہ اور بار آور عمل میں جان ڈال سکیں۔ امت مسلمہ اس اعتبار سے بہت پیچھے ہے کہ کسی شعبہ میں اس کے پاس قابل تقلید تعلیمی ادارے نہیں ہیں اس طرح دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کے تعلیمی نظام (islamisation of knowledge) کا انطباق کس صورت ہو اس لحاظ پر بھی یک گونہ خلا کا احساس ہوتا ہے۔ ہمیں آگے بڑھ کر اس خلا کو پر کرنا ہوگا اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینا ہوگا۔ تحقیق و تفحص کے بعد چھوٹے بڑے چیلنجوں کو قبول کرنا ہوگا اور ہر مسئلہ پر حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے مومنانہ بصیرت کے ساتھ رہنمائی کے لئے آگے آنا ہوگا۔

آپ جانتے ہیں کہ علمی فکری محاذ پر آج بھی نا اہل افراد اور قوموں کی بالادستی قائم ہے اور ہر چہار سو انہیں کے دیئے ہوئے نظریات و اصطلاحات، افکار و لائحہ عمل کا چرچا ہے جب کہ ان کے اندر حقیقت پسندی اور معقولیت کا زبردست فقدان پایا جاتا ہے۔ البتہ ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈے کے زور سے انہوں نے عوام الناس کو مبہوت و مسحور کر رکھا ہے۔ ضرورت ہے مثبت انداز سے ان حقائق کو پیش کیا جائے جو ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر اور حقیقت پسندانہ اور معقولیت پر مبنی ہیں۔ بلاشبہ یہ دولت آپ کو میسر ہے اور آپ ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دنیا کی نظری، فکری اور عملی رہنمائی کریں مگر اس مقام پر فائز ہونے کے لئے کردار کی بلندی، فکر کی بالیدگی اور روحانیت کی ارتقاء کی ضرورت ہے۔

اگر واضح نصب العین اور نصب العین کے لئے وارفتگی، فدا کاری اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو، اس کے ساتھ جہد مسلسل، عمل پیہم، نفس کشی، اخلاص و للہیت، خوشنودی رب اور آخرت کا استحضار بطور زاد راہ ہو۔ تو پھر دیکھئے ہماری یہ مختصر افرادی قوت کیا کارنامے انجام دے سکتی ہے۔ ہمارے سامنے ایک بڑا مسئلہ خود ہمارے گھر اور مادر علمی کا ہے۔ ہم نے بنیادی طور پر کسب فیض یہیں سے کیا ہے۔ یہیں ہماری آنکھیں کھلیں اور خزانۂ علم کی کنجی یہیں سے میسر آئی پھر جس کو اللہ نے جس قدر توفیق دی اور حالات و مواقع کی سازگاری نصیب ہوئی وہ علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھا الحمد للہ آج ہم ہر شعبہ حیات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن سخت ناشکری ہوگی اگر ہم اپنی بنیادوں سے غافل ہو جائیں اس کو حقیر اور کم سمجھ کر اس سے نظریں پھیر لیں۔

ہمیں دیکھنا ہوگا کہ علمی، تعلیمی محاذ پر جامعۃ الفلاح کا کیا مقام ہے۔ یہاں کون سے پہلو توجہ طلب اور لائق اعتناء ہیں۔ اس کی کون سی خوبیاں پروان چڑھ رہی ہیں اور بحیثیت مجموعی کن کن پہلوؤں سے زوال آیا ہے۔ اس کی افادیت بڑھانے اور عام کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جانی چاہیے۔ اس کی تعمیر و ترقی اور نفع بخشی میں ہم کیا تعاون کر سکتے ہیں۔ درست سمت میں تعلیم و تعلم کے اس آغاز کو مزید

کیسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے وغیرہ آپ جانتے ہیں کہ مادر علمی ایک مشن کا اہم حصہ ہے اور اس مشن کا اسے خشت اول کہہ سکتے ہیں اسلامائزیشن آف نالج کی دنیا میں بہت کچھ کرنا باقی ہے اس پس منظر میں ہمیں اپنے اس مادر علمی کو جو میدان تعلیم میں صحیح رخ کی بنیاد ہے اسے مضبوط سے مضبوط تر کرنا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اس رخ کو آگے بڑھانا ہے تبصرہ کرنے اور اسے کمتر سمجھنے کے بجائے اس کی ضروریات کیا ہیں۔ بہتر اساتذہ کی خدمات کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ظاہری و معنوی اعتبار سے کیا کیا جائے کہ جامعہ کا معیار تعلیم بلند ہو ان پہلوؤں پر توجہ دینی ہوگی۔ جو حضرات مادر علمی کی تعمیر و ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے انہیں تبصرہ کرنے اور تصویر مسخ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جامعہ کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضہ ہے کہ اس کے لائق فرزندان پوری توجہ صرف کر کے اس کو سنبھالنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں۔ فلاحی برادران کی کمیت و کیفیت اور مختلف میدانوں میں اثرات و نفوذ کے پس منظر میں بآسانی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہم لوگ اگر توجہ دے دیں تو انشاء اللہ العزیز نہ صرف جامعہ کے مسائل کا دائرہ محدود ہو جائے گا بلکہ تعلیمی و ترقی میدان میں نمایاں حیثیت سے یہ ادارہ منفرد مقام پر ہوگا۔ ساتھ ہی اس کی عطا کردہ ٹھوس بنیادوں پر عظیم یونیورسٹی کی تشکیل ہو سکتی ہے۔

برادران عزیز! اس آٹھویں اجلاس عام کا ایک اہم جز سمینار کا ہے انشاء اللہ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں علماء کے کردار پر گفتگو ہوگی اس اجلاس میں مذکورہ عنوان پر سمینار کی معقولیت اور مناسبت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ نہ صرف مسلم قوم بلکہ دنیائے انسانیت کی صحیح سمت میں رہنمائی کا کام ہمارا ہے اور ہم ہی کر سکتے ہیں اس دعویٰ کی صلاحیت کو پرکھنے کا یہ سمینار ایک پیمانہ ہے بلا شبہ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ مسلکی و فکری شیرازہ بندی سیاسی و معاشرتی شیرازہ بندی میں علماء کو قائدانہ کردار ادا کرنا ہوگا۔

الحمدللہ ہمارا شمار بھی علماء میں ہوتا ہے ہمیں دوسروں سے پہلے خود اپنے آپ کو دیکھنا ہے کہ کیا فی الواقع ہم اس کے اہل ہیں کہ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں کوئی مثبت رول ادا کر سکیں۔ اس مقام پر نہیں ہیں تو کہاں کہاں خلا ہے جس کی تکمیل کی جانب توجہ کی ضرورت ہے اور کیا ذرائع اختیار کئے جائیں کہ اتنے اہم موضوع پر سمینار کا اہتمام کرنے والے سر اٹھا کر لوگوں سے بات کر سکیں۔

برادران محترم: حالات کے تقاضے تو بہت ہیں اور الحمدللہ زرخیزی کی بھی کمی نہیں۔ بس ضرورت عزم و ارادہ کی ہے ٹھوس تنظیم اور فعالیت کا جذبہ اگر حاصل ہو جائے تو بہت سارے کام ہو سکتے ہیں۔

الحمدللہ اس آٹھویں اجلاس سے ہم کو اہم نقطہ آغاز بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم آئندہ کی میقات کو تنظیم کے استحکام کے نام وقف کر دیں۔ منفیات کو ختم کر دیں اور کمال اتحاد و اتفاق کے ساتھ جد و جہد کریں تو

ان شاء اللہ ہم بڑے بڑے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

آیئے ہم عہد کریں کہ اپنی انجمن کو مثالی بنائیں گے اور اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے اور اس سلسلہ میں بجز اللہ کی رضا کے ہمارا کوئی اور مطمح نظر نہیں ہوگا۔

اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور دلوں میں خلوص عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

غزل

لمحہ لمحہ موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے
ساری بستی کھیت کو بڑھتی دکھائی دیتی ہے

اس قدر خاموش ہے ماحول میرے آس پاس
دل دھڑکنے کی صدا اکثر سنائی دیتی ہے

مسند عظمت پہ بٹھلایا گیا جو شوق سے
خلق اس سے آج عزت کی دہائی دیتی ہے

گوری ناگن جب لپٹ جائے کسی کے جسم سے
پیلیا ہو جائے تو ظالم دہائی دیتی ہے

کون قاتل ہے مرا پہچانتا ہوں دوستو!
کیوں ہمارے سامنے دنیا صفائی دیتی ہے

(راشد اعظمی)

کلیدی خطاب

مقبول احمد فلاحی
(ناظم اجلاس عام)

مسلمانانِ ہند سے مراد: مسلمانانِ ہند کے زمرے میں ہر وہ فرد آتا ہے جو انڈین یونین کا شہری ہو اور خود کو مسلمان کہتا یا سمجھتا ہو۔ تاریخی پس منظر میں ہندوستانی مسلمانوں کی متعدد صورتیں ہیں۔ تجار، صوفیاء، مبلغین اور دعاۃ کے زیر اثر اسلام کی حقانیت پر سوچ سمجھ کر ایمان لانے والے، مسلمانوں کے رہن سہن، تہذیب وتمدن اور اخلاق وکردار سے متاثر ہو کر دائرہ ایمان میں داخل ہونے والے، مختلف اسباب ومحرکات کے تحت نقل مکانی کر کے ہندوستان میں آبسنے والے، مسلمان با اقتدار اور حکمراں طبقہ کے حوارین وملازمین جو بغیر سوچے سمجھے اقتدار وقت سے مرعوب یا متاثر ہو کر مسلمان بن جانے والے افراد، گروہ، اقوام، طبقات، اپنی تہذیب وثقافت، مذہبی طبقات سے دل برداشتہ ہو کر دامن اسلام میں پناہ لینے والے لوگ مسلمانانِ ہند کے زمرے میں آتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند سے مراد ایسا انسانی گروہ ہے جس کی بنیاد فکری، علمی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور روایتی گوناگوں اور مختلف پہلوؤں سے ایک دوسرے سے الگ ہے۔ بس ایک ہی قدر مشترک ہے کہ وہ خود کو مسلمان کہتا یا سمجھتا ہے۔ یہ مسلمان کہے یا سمجھے جانے والے فکری، نظری، دینی، سماجی، تہذیبی وثقافتی، سیاسی، معاشی، اخلاقی وتمدنی وغیرہ مختلف النوع طبقات اور گروہوں میں منقسم ہیں۔ مسلمان کہے جانے والوں کی ایک بڑی تعداد ان کی ہے جنھیں اس کے علاوہ کچھ نہیں معلوم کہ جیسے دوسری اقوام وطبقات ہیں ویسے ایک طبقہ مسلمانوں کا ہے اس کے علاوہ مسلمان کیا ہوتا ہے، مسلمان سے کیا مراد ہے، وہ کیوں مسلمان ہیں یا اور اس نوعیت کی کسی بات کا شعور نہیں ہے۔

ذرا آگے بڑھتے ہیں تو مسلمان کا مفہوم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ دیوبندی، بریلوی، مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی اور اہل حدیث وغیرہ ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ ان گروہوں سے انتساب رکھنے والوں کی قابل لحاظ تعداد نہیں جانتی کہ دیوبندی اور بریلوی ہونا کیا ہے اور اس کے ہونے کی معقولیت یا بنیاد کیا ہے؟ مگر پیدائشی طور پر نسلاً بعد نسلٍ ان طبقات سے وابستہ چلے آرہے ہیں۔ ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو یہی مسلمان سید، شیخ، مغل، پٹھان، انصاری، منصوری وغیرہ مختلف ذاتوں اور قبیلوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ نسلاً بعد نسلٍ

اس کا بھی ایک سلسلہ ہے جو چلا آرہا ہے اسی طرح سیاسی محاذ پر دیکھیے تو مسلمان کانگریس، بی جے پی، ایس پی، بی ایس پی وغیرہ ہر چھوٹی بڑی پارٹی میں اپنا اندراج رکھتا ہے۔ پرلطف امتزاج یہ ہے کہ بلا تکلف ایک بریلوی انصاری کانگریسی ہے اور ایک دیوبندی انصاری بھی کانگریسی ہے۔ ہر مکتب فکر کا مسلمان سماجی اور سیاسی اعتبار سے ایک دوسرے سے ایسا وابستہ اور پیوستہ ہے کہ کہیں کوئی حد امتیاز نہیں ہے۔ باہم دگر ایسے مدغم ہیں کہ دینی طبقہ کو معاشرتی یا سیاسی اعتبار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مسلم شیرازہ کا ایسا بکھراؤ ہے کہ کس کڑی کو کہاں اور کیسے جوڑا جائے عقل حیران ہو جاتی ہے۔ بکھراؤ اتنا وسیع الاطراف اور پرپیچ ہے کہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا عمل بہت مشکل نظر آتا ہے۔ پھر اس طبقہ کو کہاں اور کن بنیادوں پر مجتمع کیا جائے جو فکری اور سیاسی اور سماجی اعتبار سے کہیں نہیں ہے۔ بس وہ خود کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے، اس کے علاوہ اس کے پاس مسلمان ہونے کی کوئی علامت اور بنیاد نہیں ہے۔ اسے نہ دینی سمجھ ہے اور نہ سماجی اعتبار سے کسی مقام پر ہے اور نہ اس کی نظر میں سیاست ہی کی کوئی اہمیت ہے۔

بس دنیا میں کما کھا کر جی رہا ہے اور مر جائے گا۔ مسلمانوں کے داخلی انتشار کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور شاخ در شاخ ہے کہ اس کے سرے کا پتہ چلانا اور مسلمانوں کی زندگی کے جملہ شعبوں کو ان سے پاک کرنا اور انھیں کسی مثبت فکر پر مجتمع کرنا امر محال معلوم ہوتا ہے۔ ہر طبقہ اپنی محدود دنیا میں مگن اور اپنے حالات پر مطمئن ہے۔

اس سیمینار کے توسط سے اس وقت ہم ایسے لوگوں سے مخاطب ہیں جو حالات کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، حقائق پر ان کی نظر ہے۔ ملکی وعالمی حالات ان کے سامنے ہیں۔ ہمارے درمیان تاریخ وعمرانیات کے ماہرین بھی ہیں۔ اس سیمینار کے توسط سے ہمیں مسلمانوں کے انتشار کی پیچیدگیوں کے درمیان اتحاد وشیرازہ بندی کے جواہر تلاش کرنے ہیں اور پھر ان کی روشنی میں اتحاد ویگانگت کا فکری وعملی لائحہ عمل مرتب کرنا ہے۔ افرادی قوت کا وزن ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے دور حاضر میں ہندوستانی مسلمانوں کے پاس یہ عددی قوت بہت بڑا سرمایہ ہے۔

اس کو کیسے مفید اور کارآمد بنایا جائے کہ نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ اسلام کے حق میں اسے استعمال کیا جا سکے، اس پر غور وفکر کرنا ہے۔ مگر یہ آگے کے مراحل ہیں پہلا اور بنیادی مرحلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو کیسے اور کن بنیادوں پر مجتمع کیا جا سکتا ہے؟ اور اس نصب العین کو اختیار کر لے سے کیسے اختلاف اور فرقہ بندی ختم ہوتی ہے؟ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی کوشش میں لوگوں کو اس نصب العین سے متعارف کرانا اور نصب العین کے لیے حتی المقدور جد وجہد کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔

شیرازہ بندی کی تین سطحیں ہیں ۱۔ ابتدائی و لابدی سطح ۲۔ مقصدی و لازمی سطح ۳۔ انقلابی اور انتہائی سطح۔

۱۔ ابتدائی و لابدی سطح یہ ہے کہ ہر مسلمان کیلئے لازم ہے کہ وہ کلمہ طیبہ کا اقرار کرتا ہو اور ایمان کی بنیادی باتوں کو جانتا اور مانتا ہو۔ اگر ان باتوں کا احاطہ کیا جائے تو سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے "واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا" (تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی تھام لو اور اس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ) مسلمان ہوتے ہوئے اس بنیاد سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ علماء نے حبل اللہ سے مراد قرآن کریم کو لیا ہے۔ قرآن سے تعلق اور وابستگی ملت کی شیرازہ بندی کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، ساتھ ہی تمسک بالقرآن ہی اعتصام اور اتحاد کی اصل بنیاد ہے۔

۲۔ مقصدی اور شعوری سطح وہ ہے جس کا ذکر سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه سے ماخوذ ہے۔

یہ کہ "تم دین قائم کرو اور اس میں فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ"، ایک مسلمان کا مقصد حیات اور نصب العین اقامت دین ہے، انہیں اس نصب العین سے متعارف کرانا اور اس کے لئے حتی المقدور جدوجہد کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا۔

۳۔ انقلابی اور انتہائی سطح کا ذکر سورہ صف کی آیت ۴ میں مذکور ہے۔ "ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيل الله صفا كانهم بنيان مرصوص" بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح لڑائی کرتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ غلبہ حق کے لئے انتہائی اور بلند ترین صورت قتال فی سبیل اللہ کی ہے۔ گویا قرآن ہاتھ میں لے کر نصب العین کے مکمل شعور کے ساتھ جدوجہد کرتے ہوئے جب قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آتا ہے تو شیرازہ بندی کی انقلابی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ بالفاظ دگر شیرازہ بندی کے انتہائی مقام پر فائز ہونے کے لئے قتال فی سبیل اللہ کی منزل پر پہونچنا ہوگا۔ شیرازہ بندی کی مذکورہ بالا تینوں بنیادیں یا تینوں مراحل خالص قرآنی اور علمی ہیں۔ ہر سہ گانہ مراحل و منازل کا ادراک اسی فرد کو ہو سکتا ہے جس کی قرآن پر نظر ہو اور قرآنی علوم سے بہرہ ور ہو اور جسے قرآن کا علم ہو وہی عالم ہے اور اسی کی ذمہ داری ہے کہ ٹھوس بنیادوں پر عملی اقدامات کے لئے سامنے آئے اور فی الواقع وہی اس کا حق بھی ادا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں علماء کے کردار کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کی شیرازہ بندی پر ایک اور پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے اور ملت کی حالت زار پر متفکر اور پریشان ہونے والے افراد نہیں ہیں مسلم

ملت کا ہر باشعور فرد مسلمانوں کی ذلت و نکبت، زوال و پسماندگی پر کوئی نہ کوئی رائے رکھتا ہے۔ یہ احساس عام ہے کہ جب تک مسلمانان ہند متحد نہیں ہو گئے اور نہیں اٹھ سکتے اور موجودہ حالات میں اپنا وجود نہیں منوا سکتے ہیں مگر نااتفاقی اور انتشار کے اسباب الگ الگ بیان کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اتحاد و اتفاق کے لئے الگ الگ نسخے تجویز کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اتحاد یا انتشار کے پس پردہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ علم و عرفان سے بے تعلقی ہے۔ علم سے مراد دینی علوم کے ساتھ حالات و حادثات اور دنیا کے دیگر علوم ہیں۔

دینی علوم کی بنیاد قرآن و سنت ہے۔ فقہ، اجتہاد اور قیاس وغیرہ علوم دینیہ کی توضیح و تبیین اور معاون علوم و فنون ہیں۔ ایک ترتیب کے ساتھ سب سے استفادہ علوم دینیہ کی بنیاد ہے۔ مگر دینی علوم میں ہر ایک کا مخصوص درجہ اور مقام ہے۔ جب اس ترتیب کی رعایت ہوگی تو اتحاد و اتفاق کا اظہار ہوگا اور جب ترتیب میں انحراف ہوگا تو نااتفاقی اور انتشار رونما ہوگا۔ گویا علوم دینیہ کے مراجع اور معاون میں ترتیب کی رعایت ملحوظ، توازن اور مسلمہ اصولوں کی پاسداری اگر کی جائے تو شیرازہ بندی ہوگی اور عدم توازن اور مسلمہ اصولوں سے انحراف کے نتیجے میں تفرقہ، بکھراؤ اور انتشار عمل میں آئے گا۔ اتنی واضح اور صاف بات کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں ہی میں سے کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن ہی سب کچھ ہے اس کے علاوہ کسی اور جانب دیکھنے کی ضرورت نہیں یا احادیث تو قرآن ہی کی توضیح و تبیین ہیں لہٰذا قرآن کو اس کا جائز اور مطلوبہ مقام نہیں دیا گیا، یا ائمہ اربعہ کے مسالک پر التزام کی بنیاد یہ بنا کر کہ امام نے علمی و استنباطی بلندی سے قرآن و سنت ہی سے استفادہ کیا ہے اور بعد کے ادوار میں چونکہ کسی کو وہ مقام حاصل نہیں رہا لہٰذا فقہ ہی اصل مرجع علوم اسلامیہ ہے۔ اس طرح قرآن و سنت سے تمسک و التزام میں کمی و کوتاہی کے نتیجہ میں مختلف مسالک و مذاہب سامنے آئے اور بعد کے ادوار میں اس میں اتنی شدت آتی گئی کہ حق گویا کسی خاص مسلک ہی سے وابستہ ہے۔ ذرا اور آگے بڑھئے تو علمائے کرام، مفکرین، مصنفین اور شیوخ پر اعتماد اتنا گہرا ہو گیا کہ یہ بات بھی سامنے آنے لگی کہ آخر یہ اکابر قرآن و سنت، فقہ اسلامی ہی کے تو ترجمان ہیں ان کی آرا آ جانے کے بعد قرآن و سنت کی جانب مراجعت کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس طرح مختلف جماعتیں، نقطہ ہائے نظر، گروہ اور جماعتیں بنتی اور بٹتی رہیں۔

علم کا دوسرا پہلو حالات زمانہ سے گہری واقفیت، سیاسی بصیرت، غیر اسلام کا علم، اسلام مخالف تحریکات کا شعور وغیرہ ہے۔ اس میدان میں بھی بڑا زوال آیا ہے۔ علم کے میدان میں نمایاں طور پر دو گروہ بن گئے۔ علم دین اور علم دنیا کی باقاعدہ تقسیم ہو گئی۔ اس تقسیم نے قرآن و سنت کا علم رکھنے والے کو

حالات زمانہ سے بے خبر کر دیا اور حالات کا علم رکھنے والا قرآن وسنت اور علوم اسلامیہ سے بے نیاز ہو گیا۔ پھر جب ان دونوں طبقات نے مسلمانوں کی رہنمائی کرنی چاہی تو توازن اور صواب سے دونوں ہی محروم ہو گئے۔ قرآن وسنت تو حالات زمانہ پر اثر انداز ہونے کیلئے تھے مگر قرآن وسنت کی تعلیمات کا حالات زمانہ کے تناظر میں شعور نہ ہونے کے سبب علم دین کے ماہرین سے اکثر بے تکی باتیں سامنے آتی رہیں اور حالات زمانہ کو قرآن وسنت کی روشنی میں نہ دیکھنے کے سبب عصری علوم کے ماہرین نے ایسی ایسی بے سر پیر کی باتوں کو تریاق اور مسائل کے حل کے طور پر پورے زور وشور کے ساتھ پیش کرنا شروع کیا کہ صحیح سمت میں پیش قدمی کے بجائے ہر علاج الٹا اثر دکھانے لگا۔

ان حقائق کے باوجود اس بات کا انکار ممکن نہیں ہے کہ دنیا اور دنیوی مفادات بہر حال انسانیت کے لئے زبردست فتنہ ہیں۔ ہر دور میں ذاتی مفاد پرستی اور دنیا طلبی کی ہوس نے نہایت خوبصورت لبادے میں اپنا وجود ہر طبقہ سے منوایا ہے۔ یہی صورت حال مسلمانوں کے ساتھ بھی پیش آئی اور مسلمانوں کی من حیث القوم کم علمی اور بے شعوری کے سبب اس فتنہ نے کچھ زیادہ ہی منفی اثرات ڈالا۔ علماء، سیاست داں اور چودھراہٹ کے طلبگار سماجی کارکن ہر طبقہ میں ایسے فتنہ پرور عناصر سر اٹھاتے رہے اور اپنا وجود منواتے رہے ہیں۔ جان بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ پوری مسلم ملت کو منتشر کرنے اور منتشر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ملت کے شیرازہ کو مجتمع کرنے کی کسی بھی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا گیا۔ اس طبقہ کو اچھی طرح اس بات کا شعور تھا کہ ملت اگر مجتمع ہو گئی تو اس کے مفادات پر کاری ضرب لگے گی۔ گویا مشہور مقولہ: لوگوں کو تقسیم کرو اور ان پر راج کرو divide and rule ان کی دانستہ پالیسی بنی رہی، اور اس پالیسی کو نہایت خوبصورت اور پرکشش انداز میں دنیا کے سامنے انسانوں اور مسلمانوں کے بہی خواہ کے طور پر خود کو پیش کر کے اپنے مفادات کی حفاظت کرتے رہے ہیں اور آج بھی بعض علماء، سیاست داں اور سماجی کارکن بڑے اطمینان، استقلال اور پامردی کے ساتھ اپنا کام کئے جا رہے ہیں۔ امت کے ان سوداگروں کو بے نقاب کرنا آسان کام نہیں ہے، کیوں کہ ان عناصر نے ایسے انداز سے عوام کی ذہن سازی کی ہے کہ ان کی حرکتوں کے خلاف عوام کا ایک طبقہ ایک لفظ بھی سننے پر آمادہ نظر نہیں آتا ہے۔

سمینار کا مرکزی موضوع ”مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی اور علماء کا کردار“ ہے۔ موضوع کا تقاضہ ہے کہ مسلمانان ہند کی توضیح وتعیین ہو، مسلمانوں کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ ہو یہ شیرازہ کن مختلف النوع عناصر پر مشتمل ہے اور مذہبی، سیاسی اور سماجی بکھراو کے اسباب وعلل کیا ہیں؟ ان کو کس طرح مجتمع کیا جا سکتا ہے؟ اسی کے ساتھ علماء کا کردار بھی زیر بحث آئے گا۔

علماء کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے یہ دیکھنا ہوگا کہ علم اور علماء سے کیا مراد ہے۔ علم عربی کا لفظ ہے اور قرآن میں متعدد مقامات پر مختلف انداز سے آیا ہے۔ اسلام میں علم کی کیا تعبیر معتبر ہے، مروج علم دینی اور علم دنیوی کی حیثیت کیا ہے، قرآن نے علم الاسماء، راسخون فی العلم، علم من الکتاب، اولوا العلم اور علماء جیسے متعدد الفاظ استعمال کر کے علم کی کیا شکل دی ہے؟ ساتھ ہی علماء سے کیا مراد ہے؟ اور کس طرح کے علوم کے حاملین پر لفظ علماء کا اطلاق ہونا چاہئے وغیرہ۔

ہمارے تناظر میں علماء سے مراد وہ طبقہ لیا جاتا ہے جو کسی دینی درسگاہ سے فارغ التحصیل یعنی عالمیت اور الیات کئے ہوئے ہو۔ اس طبقہ کا تاریخ کے ہر دور میں ایک مقام رہا ہے، ہندوستان کے پس منظر میں عوام کا ایک بڑا طبقہ ان پر اعتماد کرتا ہے خصوصاً دینی ومذہبی امور ومسائل میں ان کی بات معتبر سمجھی جاتی ہے اور سماج کے اسی اعتبار کے بدولت یہ طبقہ کلا مختلف سماجی، معاشرتی، اور سیاسی امور ومسائل میں بھی رہنمائی کا کام انجام دیتا ہے۔ اسی اعتبار کی وجہ سے عوامی مقبولیت کے سبب ان کے بعض مفاد پرست عناصر مسلمانوں کا استحصال بھی خوب کرتے ہیں۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی مختلف النوع شیرازہ بندی میں کیا یہ علماء کا طبقہ کوئی مثبت رول ادا کر سکتا ہے؟ پھر ماضی میں علماء کے رول کی کیا تاریخ رہی ہے؟ دور حاضر میں علماء کا کردار کس مقام کا حامل ہے؟ یہ علماء کرام کن بنیادوں پر اور کس طرح شیرازہ بندی میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ یا کوئی کردار ادا کرنے کیلئے اپنے فکر وعمل میں کیا تبدیلی لانی ہوگی وغیرہ وذالک۔

سیمینار کے ذیلی موضوعات میں مختلف جہتوں سے عنوان کا کسی درجہ میں احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور امید ہے کہ پیش کئے جانے والے مقالات سے موضوع کے بہت سے گوشے ابھر کر سامنے آئیں گے اور امید ہے کہ اس بحث وتمحیص سے ملت کی شیرازہ بندی میں اپنا کردار ادا کرنے کیلئے علماء کو متعین لائحہ عمل بن سکے گا ان شاء اللہ۔ موضوع کی گوناگونی اور پیچیدگی کے پیش نظر یہ دعوی کرنا تو محال ہے کہ اس ایک روزہ سیمینار سے کوئی بہت واضح خطوط کار متعین ہو سکیں گے یا موضوع کی پوری طرح تنقیح ہو سکے گی۔ اس کے لئے متعدد نشستیں اور سیر حاصل بحث وتمحیص درکار ہے تاہم شیرازہ بندی جیسے اہم اور نازک مسئلہ پر اگر اس سیمینار کے طفیل علماء کرام کے سامنے سوالات ہی ابھارے جا سکیں تو بڑی کامیابی شمار ہوگی۔

آج کے حالات میں جس شدت کے ساتھ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ملت کا ہر طبقہ اپنے کردار پر غور کرے اور اپنے حصہ کا کردار ادا کرے ورنہ نہ صرف دنیا کا خسارہ ہوگا بلکہ یقینا اللہ کے دربار میں باز پرس ہوگی۔ بحیثیت مجموعی اسلام اور

مسلمانوں کی ذلت و نکبت اور زوال و ادبار میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس شخص یا گروہ کا حصہ ہوگا جس نے اپنا رول متعین کرنے اور اسے نبھانے میں کسی طرح کی کسر اٹھا رکھی ہوگی۔ انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی جانب سے منعقدہ اس آٹھویں اجلاس عام کے پس منظر میں اس سیمینار کی معنویت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ انجمن دراصل فارغین جامعۃ الفلاح کی یونین ہے اور فارغین جامعہ کا شمار بھی بہر حال طبقہ علماء میں ہوتا ہے۔ اس سیمینار کے ذریعہ فارغین جامعہ کو سوچنے اور اپنا کردار متعین کرنے میں آسانی ہوگی۔ کیا فارغین جامعہ مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی جیسے اہم چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا اس چیلنج کو قبول کرنے کا ان کے اندر حوصلہ ہے؟ اگر ان کے اندر حوصلہ ہے تو کن صفات سے انہیں خود کو متصف کرنا ہوگا اور اس محاذ پر وہ کون سا کردار ادا کرنا ہوگا جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ دیگر طبقہ علماء کیلئے مشعل راہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس اہم موضوع پر سنجیدہ و جاوداں خیال کرنے کی اور کسی مثبت نتیجہ تک پہونچنے، اپنا کردار متعین کرنے اور اسے نبھانے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین

☆☆☆

وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ
With best compliments from:
Mohd. Imran
Branch Manager
خدمات ابو للسفریات
تخلیص تسویة وترحیل العمل
ABU TRAVEL SERVICE
Manpower Consultant
Licence No. 00190/BOM/PER/100+/3/266/84
2/4, 3rd Floor, Sarai Julena, Okhla Road, New Delhi - 110025
Mob.: +91-11-9015135058 Ph.: +91-11-26325100 Fax: +91-11-26325101
e-mail: abutraveldelhi@yahoo.com

اسلام کے فکری مناہج کا جائزہ
اور
موجودہ مسلم معاشرے پر ان کے اثرات

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
(شیخ الحدیث جامعۃ الفلاح)

الحمدللہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ و علی آلہ الخیرۃ واصحابہ البررۃ

رنگ و نسل اور شکل کے اختلاف کی طرح فکر و نظر کا اختلاف بھی ایک طبعی اور فطری چیز ہے۔ ہر ایک کی فکر اور سوچ میں یکسانیت ناممکنات میں سے ہے۔ اس لئے کہ

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

البتہ ہر چیز کی طرح اس کا بھی ایک دائرہ ہے، اور اس کے حدود سے تجاوز نا روا ہے۔

کسی بھی اختلافی مسئلہ کی تہ تک پہونچنے کے لیے اسباب اختلاف، محل نزاع اور نقطہ اتحاد کو جاننا ضروری ہے کہ اس کے بغیر صحیح طور پر اختلاف کی حقیقت کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

مسلمانوں میں بعض مسائل میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس اختلاف کی حیثیت وہ نہیں ہے جو دیگر مذاہب کے فرقوں میں ہے کہ اگر ان میں سے ایک فرقہ کے نقطہ نظر کو صحیح قرار دیا جائے تو دوسرا اس مذہب کا ایک فرد نہیں رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں دین کی بنیادی باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہر فرقہ اللہ کی وحدانیت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت اور رسالت کا قائل ہے۔ تمام نبیوں اور آسمان سے نازل شدہ کتابوں اور فرشتوں پر ایمان رکھتا ہے۔ قرآن کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے جو ہر طرح کی تحریف اور تبدیلی سے پاک ہے۔ عقیدہ آخرت اور حشر و نشر کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پنج وقتہ نمازوں، رمضان کا روزہ، زکوۃ اور حج کی فرضیت پر ہر ایک متفق ہے۔ شراب، خنزیر، مردار، زنا کاری اور جوا کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے۔ غرض یہ کہ دین کے اصول ارکان اور ان چیزوں کے سلسلہ میں جو قطعی ذریعے سے ثابت ہیں ان پر تمام فرقے متحد ہیں اور جن چیزوں میں اختلاف ہے ان کی وہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کو دین اسلام سے خارج قرار دیا جائے۔

امت مسلمہ میں فرقہ بندی کی ابتداء حضرت عثمان غنیؓ کی مظلومانہ شہادت سے ہوئی۔ جس کے بعد جنگ جمل اور صفین کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے اختلاف کی خلیج گہری ہوتی گئی۔ لیکن یہ ایک سیاسی اختلاف تھا۔ عقیدہ اور نظریہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شیعان علی اور شیعان معاویہ کے نام سے میدان جنگ میں دو گروہ ضرور موجود تھے لیکن میدان فکر و نظر میں کسی فرقہ کا وجود نہیں تھا۔ اسی طرح سے حضرت علیؓ کے گروہ سے کٹ کر خوارج کے نام سے ایک فرقہ ضرور متعارف ہوا، لیکن یہ فرقہ بھی سیاسی وجوہات کی وجہ سے ملوث ہوا تھا۔

البتہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ان گروہوں نے اپنے آپ کو مذہبی رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے یہ گروہ مذہبی فرقے کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

شیعہ اور مسئلہ امامت و خلافت:

ان فرقوں میں سب سے زیادہ امامت وخلافت کا مسئلہ محل نزاع رہا ہے۔ گرچہ تمام فرقے اس پر متفق تھے کہ مسلمانوں میں ایک خلیفہ اور امام کا ہونا ضروری ہے جس کی اطاعت امت پر فرض ہے (تاریخ المذاہب ۱۲/۶ بحوالہ ابن حزم) لیکن اس کی تفصیلات کے سلسلے میں اختلاف رہا۔ اہل سنت خلافت کو قریش کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔ خوارج اور معتزلہ کے نزدیک ہر مسلمان اس کا اہل ہے جسے آزادانہ انتخاب کے ذریعہ خلیفہ بنایا جائے گا۔

زیدیہ کے علاوہ شیعہ کے تمام فرقے اس پر متفق ہیں کہ خلافت آل نبی کے ساتھ خاص ہے۔ اس خاندان کے علاوہ دوسرے کسی خاندان سے تعلق رکھنے والا مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہو سکتا ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض منصبی میں شامل تھا کہ وہ اپنے بعد آنے والے خلیفہ کی شخصی طور پر تعین کر دیں اور انھوں نے اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اور "غدیر خم" کے موقع پر بصراحت حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان فرمایا۔ اس طرح سے سابق امام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بعد آنے والے امام کی شخصی طور پر تعیین کر دے۔ اس طرح کی شخصی تعیین کے ذریعہ دنیا میں کل بارہ امام آئے۔ بارہویں امام محمد حسن عسکری اس وقت روئے زمین پر موجود ہیں لیکن پردۂ غیب میں ہیں۔

امام کے سلسلہ میں شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ ہر طرح کے گناہ سے پاک وصاف اور معصوم ہوتا ہے۔ تعزیہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تمام باتوں سے اس امت کو باخبر نہیں کیا بلکہ تدریج کے پیش نظر صرف ائمہ کو باخبر کیا اور حضرت علیؓ کے ذریعہ نسل در نسل سینہ بسینہ وہ "علوم غیبیہ" تمام ائمہ تک منتقل ہوتے رہے، جس کے ذریعہ انھیں اللہ کی کتاب میں عام کی تخصیص اور مطلق کو مقید کرنے کا حق حاصل ہے۔ ایک نبی جن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے ائمہ بھی ان تمام اوصاف سے متصف ہوتے ہیں

نبی اور وصی میں فرق صرف اس قدر ہے کہ وصی پر وحی نہیں آتی ہے (تاریخ المذاہب ۳۷/۱) ہر دور میں ائمہ موجود رہیں گے۔ کوئی زمانہ امام کے وجود سے خالی نہیں ہوگا۔ اس عقیدہ کے مطابق آخری امام اس وقت موجود ہیں لیکن ہماری نظروں سے روپوش ہیں۔

شیعوں کا ایک فرقہ زیدیہ کے نام سے معروف ہے جو حضرت حسینؓ کے پوتے زید بن علی کی طرف منسوب ہے اور جن کی ایک بڑی تعداد آج بھی یمن میں موجود ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شخصی طور پر نہیں بلکہ صفاتی طور پر امام کی تعیین کی تھی اور وہ تمام صفات حضرت علی پر منطبق ہوتی تھیں۔ لیکن یہ اوصاف خلافت کی صحت کے لئے شرط نہ تھیں اس لئے حضرت ابو بکر و عمر وغیرہ کی خلافت بھی درست ہے۔ اللہ کی ذات وصفات، جبر وقدر اور مرتکب کبیرہ کے سلسلہ میں امامیہ اور زیدیہ دونوں اعتزال کی طرف مائل ہیں۔

خلافت و امامت کی اس تشریح کے باوجود اکثر شیعہ علماء صحابہ کرام پر نہ تو لعن طعن کے قائل ہیں اور نہ انھیں فاسق و کافر قرار دیتے ہیں۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:

والحاصل اننا لم نجعل بينه و بين النبي صلى الله عليه وسلم الا رتبة النبوة واعطيناه كل ما عدا ذالك من الفضل المشترك بينه و بينه ولم نطعن اكابر الصحابه الذين لم يصح عندنا انه طعن فيهم تاریخ المذاہب ۳۷/۱

اس موقع پر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ حضرت علیؓ اور ان کے گھرانے کے سلسلہ میں شدت محبت کا پس منظر کیا ہے؟ وہ کیا عوامل ومحرکات تھے جن کی وجہ سے اس طرح کے نظریات وجود پذیر ہوئے۔ خاندان نبوت سے جذباتی تعلق اور محبت، حضرت علیؓ کی ہمہ جہت شخصیت، ان کی صالحیت اور صلاحیت، علم و دیانت اور پھر ان کی شہادت، حضرت حسنؓ کی مشتبہ وفات اور اس کے بعد کربلا کا افسوس ناک سانحہ وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان سے تعلق سے وارفتگی بڑھتی گئی اور پھر جو لوگ ان سے متعلق تھے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے، زیاد بن ابیہ نے طاقت کے بل بوتے پر ان سے محبت اور تعلق کو ختم کرنا چاہا اور حجاج نے دلوں سے ان کے نقش کو مٹانا چاہا۔ "لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ محبت میں غلو اور شدت آتی رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے سینہ بہ سینہ نقل ہونے والی روایات وحکایات اور عقلی دلائل کی بنیاد پر اپنی محبوب شخصیات کو ان تمام اوصاف کا حامل بنا دیا جو ایک نبی کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔

فرقہ خوارج (اباضیہ)

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بعض سیاسی وجوہات کی بنیاد پر ایک جماعت ان کے لشکر سے

الگ ہوگئی جو "خوارج" کے نام سے متعارف ہوئی۔ آج اس نام سے کوئی فرقہ روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔ البتہ فرقہ اباضیہ کے نام سے مسلمانوں میں ایک گروہ پایا جاتا ہے، جس کے پیروکار عمان، لیبیا، مراکش اور زنجبار وغیرہ میں موجود ہیں اور عمان کا حکمراں طبقہ بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس فرقہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خوارج کی ایک شاخ ہے۔ لیکن یہ لوگ اس تعلق سے انکاری ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے اس لئے کہ محض چند مسائل میں یکسانیت کی وجہ سے کسی کو "خوارج" کے ساتھ جوڑا نہیں جاسکتا۔

فرقہ اباضیہ، عبداللہ بن عباض کی طرف منسوب ہے جن کی وفات عبدالملک بن مروان کے آخری دور میں ہوئی۔ یہ فرقہ بحیثیت دلیل کتاب وسنت پر اعتماد کرتا ہے۔ حدیث کے سلسلہ میں ان کے یہاں سب سے زیادہ معتبر کتاب "مسند ربیع بن حبیب" ہے جو دوسری صدی ہجری کی تالیف ہے اور مطبوع ومتداول ہے۔ اجماع اور قیاس کے بھی قائل ہیں۔ "کتاب العلل وشفاء العلیل" ان کے معتقدات اور نظریات پر مشتمل ایک جامع کتاب ہے، عقائد کے سلسلہ میں یہ اعتزال سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے معتزلہ کے ساتھ ہی ان کے عقائد کا تذکرہ کیا جائے گا۔

فرقہ معتزلہ:

قیصر وکسریٰ کے زوال کے بعد ان کے پیروکاروں نے یہ محسوس کیا کہ میدان جنگ میں اب مسلمانوں کو شکست نہیں دی جاسکتی ہے۔ اس لئے اب عقائد ونظریات کے میدان میں جنگ لڑی جائے اور مسلمانوں کے معتقدات پر ضرب لگائی جائے اور عقیدہ کے سلسلہ میں انھیں شک وشبہ میں مبتلا کیا جائے۔ اگر یہ میدان ان کے ہاتھ آگیا تو پھر میدان حرب وضرب میں بھی انھیں مات دینے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ پھر کیا تھا ایک طویل جنگ کا اعلان کردیا۔ لیکن مسلمان اس میدان سے بھی غافل نہیں تھے ان میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کی اور ان کے پیدا کئے ہوئے شکوک وشبہات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ انھیں جن لوگوں سے سابقہ تھا ان کے سامنے آیات کی تلاوت اور احادیث کی روایت کردینا کافی نہیں تھا بلکہ ان کو مطمئن کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ انھیں کے لب ولہجہ میں گفتگو کی جائے۔ جن ہتھیاروں سے وہ حملہ آور ہو رہے تھے ان سے تیز تر ہتھیار کے ذریعہ ان کا جواب دیا جائے۔ اس لئے انھوں نے فلاسفہ اور زنادقہ اور مرجیہ اباحیہ کے رد میں فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی اور اسلامی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے عقلی دلائل کا سہارا لیا۔ اس فرقہ نے جسے معتزلہ کے نام سے جانا جاتا ہے اسلام کے دفاع میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں جسے تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ رکھا ہے۔

لیکن مسلمان جماعتوں میں بدقسمتی سے باہمی تعاون کا فقدان رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ایک

فرقہ کو اس کے میدان میں کام کرنے دیا جائے اور اس کی خدمات کو سراہا جائے خاموشی سے اسے برداشت کرلیا جائے ہر فرقہ باہم دست بگریباں ہونا زیادہ پسند کرتا ہے۔ محدثین اور معتزلہ کے ساتھ بھی یہی ہوا اور ایک وقت ایسا آیا کہ اپنے اپنے میدانوں میں کام کے بجائے یہ دونوں جماعتیں آپس میں الجھ گئیں۔ معتزلہ کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے انھوں نے طاقت کے بل بوتے پر دوسرے فرقہ پر زیادتیاں کیں۔ مظلوموں کو عوامی ہمدردی ملتی رہی اور معتزلہ بدنام ہوتے رہے۔ طاقت کے ذریعہ انھوں نے اپنے فلسفیانہ نظریات تھوپنے کی کوشش کی جسے مسلمانوں نے یکسر مسترد کردیا۔ اور ظلم کا انجام یہ ہوا کہ یہ فرقہ نیست ونابود ہوگیا۔ بحیثیت فرقہ اس کا وجود ختم ہوچکا ہے۔ لیکن اس کے بہت سے نظریات آج بھی زندہ ہیں۔ شیعہ، اباضیہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ کے افکار ونظریات میں اس کی جھلک ملتی ہے۔ اس لئے اختصار کے ساتھ ان کے عقائد کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

معتزلہ اسلامی عقائد کے ثبوت کے لئے عقل کو معیار اور پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ آیات وروایات سے ثابت عقائد اگر اس معیار پر پورے اترتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر اس کی تاویل کرکے اسے عقل کے مطابق بناتے ہیں۔ اس لئے وہ اللہ کی صفات جیسے "سمیع، بصیر" وغیرہ کی تاویل کرکے قوت سمع اور "قوت بصر" مراد لیتے ہیں۔ قرآن کو مخلوق قرار دیتے ہیں۔ تقدیر کے سلسلہ میں ان کا عقیدہ ہے کہ انسان مختار مطلق ہے اور خود ہی اپنے افعال کا خالق ہے۔

گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا نہ مومن ہے نہ کافر۔ بلکہ ایمان وکفر کے درمیانی درجے میں ہے اور بغیر توبہ مرجائے تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ عذاب قبر کے منکر ہیں اور "صراط" ومیزان وغیرہ کو مجازی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ اور اسی طرح سے آخرت میں "رویت باری" کی نفی کرتے ہیں اور شفاعت کے منکر ہیں۔

واضح رہے کہ معتزلہ نے صفات کا انکار یا تاویل مشبہ اور مجسمہ کی تردید میں کی ہے جو اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے تھے، اللہ پر اپنے وعدہ وعید کو پورا کرنا واجب ہے اور یہ کہ مرتکب کبیرہ نہ مومن ہے نہ مشرک۔ یہ نظریہ انھوں نے مرجیہ کے مقابلہ میں اپنایا جو اس بات کے قائل تھے کہ جس طرح سے کفر کے ساتھ کوئی نیکی معتبر نہیں ہے اسی طرح سے ایمان کے ساتھ کوئی معصیت معتبر نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے اباحیت، احکام اسلام سے روگردانی اور لاپرواہی عام ہورہی تھی۔

قرآن کو مخلوق قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ نصاریٰ مسلمانوں کے درمیان اس بات کو رواج دے رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ قرآن کے بیان کے مطابق کلمۃ اللہ ہیں اور اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیر مخلوق ہیں۔

میں شاذ تو معتزلہ کے عقائد سے متفق ہوں اور نہ ان کا دفاع مقصود ہے۔ مجھے تو بس یہ دکھانا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ان کے خیال میں ان کے میدان کے مناسب وہی تھا۔ قطع نظر اس سے کہ انھوں نے صحیح سمجھا یا غلط۔ انھوں نے اسلام کے دفاع میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔

اشاعرہ:

یہ فرقہ ابوالحسن الاشعری کی طرف منسوب ہے، جن کا تعلق مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری کے خاندان سے ہے۔ ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۳۰ھ میں بغداد میں وفات ہوئی۔ تعلیمی اور فکری زندگی کی شروعات مکتب اعتزال سے ہوئی۔ مشہور معتزلی ابوعلی الجبائی کے ممتاز شاگردوں میں شمار ہوتے تھے اور استاد کی غیر موجودگی میں ان کی نیابت کرتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اس فلسفہ سے بیزار ہو گئے اور علی الاعلان فقہاء و محدثین کے نظریہ کو اپنا لیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے "الابانہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں تفصیل سے اپنے عقائد کو بیان کیا اور اجمالی طور پر یہ اعتراف کیا کہ میں تمام عقائد میں امام احمد بن حنبل کا پیروکار ہوں۔ لیکن زیادہ دنوں تک یہ جوش اور جذبہ برقرار نہیں رہا۔ وہ محدثین کے ساتھ کچھ ہی دور چلے تھے کہ پھر پلٹ کر واپس آ گئے اور "اللمع" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اعتزال سے دور اور محدثین سے قریب رہ کر درمیان کی راہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تیسری صدی ہجری میں اعتزال کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن ان کے جانے کی وجہ سے میدان کو خالی دیکھ کر فلاسفہ، قرامطہ اور باطنیہ وغیرہ اپنے بال و پر پھیلانے لگے تھے اس لیے انھوں نے اور ان کے بعد ان کے شاگردوں نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی اور فلسفیانہ اسلوب میں ان کے دلائل کی تردید کی۔

اشاعرہ کے نزدیک عقیدے کے ماخذ تین ہیں۔ (۱) عقل (۲) عقل و نقل دونوں۔ (۳) محض نقل۔ محض عقل سے ثابت صفات کو صفت عقلیہ کہا جاتا ہے اور وہ کل سات ہیں حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام۔ وہ صفات جو محض نقل سے ثابت ہوں انھیں خبریہ کہتے ہیں جیسے "ید"، "عین"، "استویٰ علی العرش" اس کی وہ تاویل کرتے ہیں۔ لیکن غیبی امور اور آخرت سے متعلق مسائل جیسے عذاب قبر، صراط، میزان وغیرہ کو حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔

صفات کے سلسلہ میں معتزلہ اور جہمیہ صرف وجود، قدم، بقاء اور وحدانیت کے قائل ہیں اور دیگر صفات جیسے سمع، بصر اور کلام وغیرہ کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذات باری کے علاوہ کسی اور کا وجود نہیں ہے۔ رحمان و رحیم جیسی صفات کو وہ اسم ذات قرار دیتے ہیں۔ حشویہ اور مجسمہ وغیرہ ان صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس کرتے ہیں۔ اشاعرہ نے ان دونوں کے بیچ کی راہ نکالنے کی کوشش کی۔

فرقہ جبریہ کا نظریہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے کسی کام کی انجام دہی میں اس کے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔ معتزلہ کا خیال ہے کہ انسان "مختار مطلق" ہے۔ وہ اپنے افعال کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسی صلاحیت رکھ دی ہے جس کی وجہ سے اپنی تقدیر وہ خود اپنے ہاتھوں سے لکھتا ہے۔ اشاعرہ نے کہا کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہے اس لیے انسان اپنے افعال کا کاسب ہے خالق نہیں۔ (جبریہ سے زیادہ قریب ہے الخلق من کسب الاشعری۔)

آخرت میں مومنین اللہ کے دیدار سے شرف یاب ہوں گے۔ فرقہ مشبہ نے کہا کہ ہم آخرت میں اللہ کو اسی طرح ایک مکان اور سمت میں دیکھیں گے جس طرح کہ ایک انسان کو دیکھتے ہیں۔ معتزلہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ حدود، جہت اور مکان سے پاک ہے۔ اس لیے اسے دیکھنا ممکن نہیں۔ اشاعرہ نے کہا کہ حدود، جہت اور مکان کے بغیر بھی اللہ کو دیکھنا ممکن ہے اور یہ چیز عقل و نقل دونوں سے ثابت ہے۔

ان تین مثالوں کے ذریعہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح سے اشاعرہ نے معتزلہ سے ہٹ کر اور جہمیہ وغیرہ سے بچ کر درمیان کی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

قطع نظر اس کے کہ وہ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔ انھوں نے قرآن و سنت سے قریب رہتے ہوئے باطل فرقوں کی تردید کی اور جو مسلمان ان سے متاثر ہو کر دین و ایمان سے بیزار ہو چکے تھے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

ماتریدیہ:

یہ فرقہ ابومنصور ماتریدی (وفات ۳۳۳ھ) کی طرف منسوب ہے۔ "ماترید" سمرقند کا ایک محلہ ہے جس کی طرف نسبت کر کے انھیں ماتریدی کہا جاتا ہے۔ یہ ابوالحسن اشعری کے معاصر ہیں اور دونوں کے نظریات تقریباً یکساں ہیں۔ لیکن نظریات اور نتائج میں یہ یکسانیت کیسے آئی کیا ان دونوں میں باہمی ملاقات ہوئی ہے یا دونوں ایک دوسرے کی کتابوں سے مستفید ہوئے ہیں۔ تاریخ ان دونوں کے جواب سے خاموش ہے۔

بعض لوگوں نے ان دونوں کے نظریات میں فرق کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابوالحسن اشعری معتزلہ سے بہت دور اور محدثین کے زیادہ قریب ہیں۔ یہ درست ہے کہ ابوالحسن اشعری میدان کارزار میں موجود تھے یعنی بصرہ میں رہائش پذیر تھے جو اعتزال کا گڑھ تھا، اور قریب ہی قریب دیگر فرقوں کے بھی مراکز تھے۔ معتزلہ اور محدثین کے درمیان مناظرہ کا بازار گرم تھا، ایک فریق کی حیثیت سے وہ خود بھی ان مناظروں میں شریک رہتے تھے جب کہ ابومنصور ماتریدی ان تمام جھگڑوں سے دور سمرقند میں بیٹھے

ہوئے تھے۔ انھیں اعتزال کے بعض نظریات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی اور وہ ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور پھر تردید اور موافقت کی کوشش کرتے۔

ایک مثال کے ذریعہ ان دونوں نظریات میں فرق کی وضاحت کی جارہی ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اشیاء میں حسن وقبح ذاتی ہے، اس اعتبار سے وہ اشیاء کی تین قسمیں کرتے ہیں۔ (۱) عقل جن کے حسن کا فیصلہ کرتی ہے۔ (۲) عقل جنھیں قبیح قرار دیتی ہے (۳) جس کے حسن وقبح میں عقل متردد ہے اگر اس آخری قسم میں شریعت کی طرف سے بجالانے کا حکم آجائے تو وہ حسن ہے اور ممانعت آجائے تو قبیح ہے۔ اور جن چیزوں کے حسن وقبح کا فیصلہ عقل کرتی ہے ان پر عمل کرنا یا ترک کردینا بربنائے عقل ضروری ہے یعنی انسان مکلف اور پابند ہے عقل کی وجہ سے اس لئے کہ عقل یہاں پر حاکم ہے۔

اشاعرہ کہتے ہیں کہ اشیاء میں حسن وقبح ذاتی نہیں ہے بلکہ یہ حسن وقبح شریعت کے امر ونہی کی وجہ سے آتا ہے۔ شریعت نے جس کا حکم دیا ہے وہ حسن ہے اور جس سے روکا ہے وہ قبیح ہے۔

ماتریدیہ معتزلہ کے ساتھ مذکورہ تقسیم پر اتفاق رکھتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ اشیاء کے حسن وقبح کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تکلیف کے سلسلہ میں عقل حاکم نہیں ہے بلکہ شریعت حاکم ہے۔ شریعت کی طرف سے امر ونہی آجانے کی وجہ سے ہم اس پر عمل کے پابند ہیں۔

ان فرقوں کے درمیان جن مسائل میں اختلافات ہوئے ہیں اگر ان کو سمیٹا جائے تو بنیادی طور پر تین لفظوں سے عبارت ہے۔ ذات وصفات، جبر وقدر اور مسئلہ امامت۔ اور یہ تینوں مسئلے ایسے ہیں کہ ان میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ ان میں سے کسی ایک مسئلے کی وجہ سے کسی کی تکفیر نہیں کی جاسکتی ہے۔

ان مسائل میں اختلاف ایک ناگوار حقیقت ہے جسے مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔ البتہ برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر فرقہ دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرے اور "نقطۂ اتحاد" اور نمایاں کرنے کی کوشش کرے کہ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے امت میں دیرپا اتحاد کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے اور امت کی شیرازہ بندی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔

ان نظریات پر بحث ومباحثہ اور مناظرہ بہت ہوچکا مگر لاحاصل۔ کتابیں اتنی لکھی گئی ہیں کہ ایک بڑا کتب خانہ اس کے لئے ناکافی مگر غیر مفید۔ ان کے کڑوے کسیلے پھل سے آج تمام کام ودہن بدمزہ۔ (کیا اس امت کے قائدین، مفکرین اور علماء بس اتنی سی کشادہ دلی کے لئے تیار ہیں کہ وحدت امت کے مثبت پہلو پر نہ کہ کسی بیرونی دشمن کے خوف سے وہ بس ایک دوسرے کو گوارا کرلیں اور تکفیری مہم سے باز آجائیں اور صفات وجبر وقدر کی لاحاصل بحث سے اور مسئلہ امامت جیسے ماضی کے قصے سے مناظرہ کا بازار گرم نہ کریں اور ذہنوں میں اتحاد کا شعور بیدار کریں۔)

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات ومنات

آخر میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ:

ہوجائے روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات

☆☆☆

حدیث قدسی

"حضرت ابوامامہ باہلیؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سورہا تھا کہ دو شخص میرے پاس آئے۔ وہ میرا شانہ پکڑ کر ایک دشوار گزار پہاڑ کے پاس لے گئے اور اس پر چڑھنے کو کہا۔ میں نے کہا اس پر چڑھائی میری سکت سے باہر ہے۔ انھوں نے کہا چڑھو۔ ہم سہارا دیتے ہیں، چنانچہ میں چڑھ گیا۔ جب پہاڑ کے بیچ میں پہنچا تو شدید قسم کی چیخیں سنیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا چیخیں سنائی دے رہی ہیں؟ انھوں نے بتایا یہ جہنم والوں کی چیخیں ہیں۔ پھر مجھے اور آگے لے جایا گیا تو دیکھا کچھ لوگ الٹے ٹانگ دیئے گئے ہیں، ان کے جبڑے پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ان سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا یہ وہ لوگ ہیں جو رمضان کے دنوں میں کھاتے پیتے تھے، روزے نہیں رکھتے تھے"۔

"سفینۂ نجات" از مولانا جلیل احسن ندوی

(بحوالہ المنذری بحوالہ صحیح ابن خزیمہ وابن حبان)

فقہی مسالک کی حقیقت

اور

موجودہ حالات میں امت پر ان کے مثبت ومنفی اثرات کا جائزہ

شیخ رضاء اللہ عبدالکریم مدنی

مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں علماء کا کردار جو اس سمینار کا بنیادی عنوان ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم فقہی مسالک کی حقیقت، الدوماعلیہ کی صورت میں پیش کریں تو حقیقت یہ ہے کہ ہم موضوع سے بہت دور نکل جائیں گے اور مقصد کا حصول مشکل ہو جائے گا کیونکہ عہد رسالت، عہد صحابہ، عہد تابعین وتبع تابعین جو خیر القرون کے عظیم لقب سے موسوم ہیں ان کے زمانوں کے حالات دینی، سیاسی اور فکری کیا رہے اس کا جائزہ لینا از بس ضروری ہوگا کیونکہ بعد کی صورت حال کو سمجھنا یا اس پر کوئی حکم لگانا یا اس پر تبصرہ کرنا قدیم صورت حال سے صرف نظر کر کے ممکن نہیں اور یہ تفصیلات نہ صرف وقت طلب ہیں بلکہ ان ادوار کے دینی، سیاسی اور فکری احوال کے ساتھ ان عوامل وعناصر کی نشاندہی بھی ضروری ہوگی جو اس تبدیلی کا سبب تھے۔ افراد واشخاص سے بحث کرنا بھی ضروری ہوگا، جنھوں نے ان حالات میں اپنا کردار نبھایا اور دینی، سیاسی یا فکری قیادت کی۔

ظاہر ہے اس مختصر مقالے میں ان تمام تفصیلات کی گنجائش نہیں اور نہ یہ ہمارے اس سمینار کے مرکزی موضوع سے متعلق ہیں۔

لہٰذا ہم فقہی مسالک کے وجود پذیر ہونے کے بعض ان اہم اسباب کی نشاندہی کریں گے جنھوں نے ان فقہی مسالک کو باقاعدہ الگ الگ مکاتب فکر کی حیثیت دے کر ان کو پروان چڑھایا اور روش قدیم سے انحراف ان کے لئے ضروری ٹھہرا۔

فقہی مسالک اور ان کی ابتداء:

اہل علم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے زمانہ میں کسی خاص شخص کے نام کا نہ مذہب تھا اور نہ مسلک اور نہ ہی کسی خاص شخص کی تقلید ہی کا رواج ہوا تھا۔ تابعین کا زمانہ بھی کسی خاص شخص کے مسلک یا مذہب سے ناآشنا تھا۔ وہ لوگ مسائل میں اور ہر طرح کے حادثہ

کے وقت اس کا حکم قرآن وسنت میں تلاش کرتے تھے اگر مل گیا تو کسی اور طرف نہ دیکھتے تھے ورنہ اگر وہاں تک رسائی نہ ہوئی تو اجماع صحابہ کو دیکھتے۔ اگر اس میں بھی ناکامی ہوئی تو اقوال صحابہ کو تلاش کرتے اگر ان میں متفق علیہ قول مل گیا تو فبہا ورنہ متعدد اقوال کی صورت میں ترجیح کے اصول کو اپناتے۔ اس دور میں نہ جمود تھا اور نہ تحفظ، نہ کوئی ایسی شخصیت تھی جس کے اقوال وافعال کو وہ اپنے لئے لازم جانتے ہوں۔ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ اصل بنیاد تھی۔ باقی اجماع وقیاس کی ضرورت کے وقت حتی الامکان اجماع اور مجبوری میں قیاس کا راستہ اختیار کرتے۔

یہ صورت حال علماء فقہاء وعوام تمام کے لیے یکساں تھی نہ علماء وفقہاء ہی کسی مخصوص مسلک کے پیرو تھے اور نہ عوام کسی مخصوص شخصیت کی تقلید کرتے تھے۔ کیف ما اتفق مسئلہ کسی بھی عالم سے دریافت کر لیا جاتا تھا۔

اس زمانے کے بعد تبع تابعین کا زمانہ آیا۔ اس زمانہ کا ماحول گزشتہ ادوار سے مختلف نہ تھا۔ کسی خاص شخص کا مذہب یا مسلک مقرر نہ تھا جس کی تقلید کی جاتی یا اس کی باقاعدہ دلیل کا التزام رہا ہو۔

یہ زمانہ درحقیقت ائمہ مجتہدین حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، حضرت امام مالک رحمہ اللہ، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ، حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا ہے۔

۱۔ حضرت امام ابوحنیفہ

النعمان بن ثابت بن زوطی المولود ۸۰ھ نے کوفہ جو اس وقت علم وعلماء کا مرکز تھا وہاں کے علماء سے اخذ علم کیا، علم وفضل زہد واستغناء کے ساتھ فہم وذکاوت میں اپنے عہد میں ممتاز تھے۔

کوفہ میں ان کے ہم عصر فقہاء میں حضرت امام سفیان بن سعید الثوری المولود ۹۷ھ المتوفی ۱۶۱ھ، وشریک بن عبداللہ النخعی المولود ۹۵ھ المتوفی ۱۷۷ھ و محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔ المولود ۷۴ھ المتوفی ۱۴۸ھ ان تینوں حضرات کے درمیان سو تفاہم کی فضا قائم تھی۔

امام ابوحنیفہؒ کے ارشد تلامذہ میں مندرجہ ذیل حضرات کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔

۱۔ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری المولود ۱۱۳ھ المتوفی ۱۸۳ھ

۲۔ زفر بن الہذیل بن قیس الکوفی المولود ۱۱۰ھ المتوفی ۱۵۸ھ

۳۔ محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی مولاہم۔ المولود ۱۳۲ھ المتوفی ۱۸۹ھ

۴۔ الحسن بن زیاد اللولوی الکوفی مولی الانصار۔ المتوفی ۲۰۴ھ

یہ چاروں حضرات جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے معارف وفقہ کے مبلغ وشارح ہیں ان ہی حضرات کی کوششوں سے مذہب حنفی مدون ہوا اور خصوصاً حضرت امام ابو یوسف وامام محمد کے سبب جن کا بڑا عباسی دربار میں اثر تھا، مذہب حنفی کے پھلنے پھولنے میں ان حضرات کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔

۲۔ حضرت امام مالک بن انس

امام مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر المتوفی ۱۷۹ھ علماء مدینہ سے کسب علم کیا اور ستر علماء و فقہاء عصر نے جب ان کو روایت و فتویٰ کے لئے اہل قرار دیا تو انھوں نے مسجد نبوی میں اپنی مسند درس بچھادی۔ علم، حلم، وقار، سنجیدگی ان کا وصف خاص تھا۔

ان کے تلامذہ کی اکثریت مغرب، اندلس، مصر، بصرہ، بغداد اور خراسان سے متعلق رہی۔

آپ کے مشہور تلامذہ میں یہ حضرات ہیں۔

(۱) ابومحمد عبداللہ بن وہب بن مسلم القرشی، مولاہم، المولود ۱۲۵ھ المتوفی ۱۹۷ھ

(۲) ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن القاسم العتقی مولاہم المتوفی ۱۹۱ھ

(۳) اشہب بن عبدالعزیز القیسی العامری الجعدی المولود ۱۴۰ھ المتوفی ۲۰۴ھ

(۴) ابومحمد عبداللہ بن عبدالحکم بن اعین بن الیث المتوفی ۲۱۴ھ

اندلس وافریقہ کے ان کے مشہور تلامذہ یہ ہیں:

(۱) ابوعبداللہ زیاد بن عبدالرحمٰن القرطبی الملقب شبطون المتوفی ۱۹۳ھ

(۲) عیسیٰ بن دینار الاندلسی توفی بطلیطلہ المتوفی ۲۱۲ھ

(۳) یحییٰ بن یحییٰ ابن کثیر اللیثی مولاہم المتوفی ۲۳۴ھ

ان حضرات کے علاوہ بھی جماعت کثیرہ نے آپ سے حدیث وفقہ میں مہارت حاصل کی۔

۳۔ حضرت امام محمد بن ادریس الشافعی المولود ۱۵۰ھ

ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع الشافعی المطلبی۔

آپ کی پیدائش غزہ عسقلان کی ایک بستی میں حالت یتیمی میں ہوئی۔ فہم وفراست بلا کی تھی۔ بچپن مکہ میں گزرا۔ مکہ و مدینہ میں اہل علم کی ایک بڑی جماعت سے تحصیل علم کیا۔ یہاں تک کہ اپنے اساتذہ کے ہوتے فتوے دینے لگے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا۔ امام محمد بن الحسن شاگرد امام ابوحنیفہ سے خوب صحبتیں رہیں اور مناظرات بھی۔

ان کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے جن میں عراقی ومصری تلامذہ میں یہ حضرات مشہور ہیں:

(۱) ابوثور ابراہیم بن خالد بن الیمان الکلبی البغدادی المتوفی ۲۴۰ھ

(۲) احمد بن حنبل الامام المولود ۱۶۴ھ

(۳) الحسن بن محمد الصباح الزعفرانی البغدادی المتوفی ۲۶۰ھ

(۴) ابوعلی الحسین بن علی الکرابیسی

(۵) یوسف بن یحییٰ البویطی المصری المتوفی ۲۳۱ھ

(۶) ابوابراہیم اسماعیل بن یحییٰ المزنی المصری المولود ۱۷۵ھ المتوفی ۲۶۴ھ

ان حضرات کے علاوہ بھی علماء کی ایک کثیر جماعت نے آپ کی شاگردی پر فخر کیا۔

۴۔ حضرت امام احمد بن حنبل

احمد بن حنبل بن ہلال الذہلی الشیبانی المروزی ثم البغدادی، المولود ۱۶۴ھ، امام اہل الحدیث صاحب المسند المتوفی ۲۴۱ھ

آپ کے ارشد تلامذہ میں ۲۱۸ سے ۲۳۳ تک فتنہ خلق قرآن میں ابتلائے محن رہے

(۱) ابوبکر احمد بن محمد بن ہانی المعروف بالاثرم

(۲) احمد بن محمد بن الحجاج المروزی

(۳) اسحٰق بن ابراہیم المعروف بابن راہویہ

یہ حضرات وہ ہیں جن کے تلامذہ نے ان کے علوم ومعارف کو زمانہ میں پھیلایا اور حالات زمانہ نے ان کی مساعدت کی اور وہ آج تک باقی ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی تھے جن کو وہ مواقع حاصل نہ ہوئے جس کے سبب ان کے مذاہب ایک خاص وقت کے بعد ختم ہو گئے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ ان کے علم وفضل میں کوئی کمی نہ تھی ہاں حالات نے ساتھ نہ دیا جس کے سبب ان کو دوام حاصل نہ ہو سکا۔

اس کی اور بھی بعض مخصوص وجوہات رہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ مختصراً آگے آ رہا ہے۔

۵۔ حضرت امام ابوعمرو عبدالرحمٰن بن محمد الاوزاعی المولود ۸۸ھ المتوفی ۱۵۷ھ

نہایت ذکی فہیم اور ادب عالیہ کے حامل تھے۔ بنو امیہ کے قتل عام پر عبداللہ بن علی کے ساتھ ان کی حق گوئی کا واقعہ مشہور ہے۔

ان کے متبعین کی زیادہ تر تعداد شام میں تھی ایک زمانہ میں شام کا قاضی بھی اوزاعی المسلک تھا۔ بنو امیہ کے جو افراد شام سے بھاگ کر اندلس پہونچے ان کے ساتھ امام اوزاعی کا مسلک بھی اندلس پہونچا لیکن شام میں، امام شافعی کے مذہب کے مقابلے اور اندلس میں امام مالک کے مذہب کے مقابلے جلد ہی وہ ا   ول کا شکار ہوا اور رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ اگر ان کے تلامذہ اور متبعین کو کسی امیر، خلیفہ کی عنایت حاصل ہو جاتی یا ان کے تلامذہ کو منصب قضا وغیرہ حاصل ہو جاتا تو یہ مذہب بھی باقی رہتا۔

۷۔ حضرت امام ابوسلیمان داؤد بن علی بن خلف الاصبہانی المعروف بالظاہری المولود ۲۰۲ھ بالکوفہ۔ المتوفی ۳۲۰ھ

انہوں نے علوم وفنون میں مہارت تامہ اپنے عہد کے علماء وفضلاء ومحدثین سے حاصل کی۔ ابتداء میں امام شافعی کے ساتھ تعصب کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور ان کے مسلک کی ترویج میں حصہ لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ خود اجتہاد مطلق کا دعویٰ کیا اور کتاب وسنت کے ظاہر پر عمل کی دعوت دینے کے ساتھ قیاس کا بالکلیہ انکار کر دیا اور عمومات قرآن وسنت کو کافی سمجھتے ہوئے قیاس کی تردید میں مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ ابطال التقلید۔ ابطال القیاس وغیرہ ان کی کتابیں بہت مشہور ہوئیں ان کے مشہور متبعین میں ابوالحسن عبداللہ بن احمد محمد بن المغلس المتوفی ۳۲۴ھ وابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزم الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ صاحب المحلی ہیں۔ ان کا مذہب پانچویں صدی کے نصف تک باقی رہا مگر ان کے جیسا علم وفضل کسی میں پیدا نہ ہو سکا۔ دوسری طرف عالم اسلام میں طرح طرح کی تبدیلیوں نے ان کو پنپنے کی مہلت نہ دی۔

۸۔ حضرت امام ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری المولود ۲۲۴ھ۔ بآمل طبرستان

ابتداء امام شافعی کے مذہب پر فقہ کا حصول کیا اس کے بعد امام مالک ودیگر ائمہ کے متبعین جو اس زمانے میں موجود تھے ان سے علم حاصل کیا یہاں تک کہ قرآن وسنت اور آراء علماء فقہاء سے اتنا بڑا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں اپنے اجتہادات کو مدلل ذکر کیا۔ ان کی تاریخ وتفسیر تمام زمانہ میں مشہور ہے اس کے علاوہ بہت سی کتابیں لکھیں۔

متعدد علماء نے ان کے مذہب کو قبول کیا جن میں مندرجہ ذیل حضرات مشہور ہیں:

(۱) علی بن عبدالعزیز بن محمد بن الدولابی

(۲) ابوبکر محمد بن احمد بن محمد ابی الثلج الکاتب

(۳) ابوالحسن احمد بن یحیی المنجم المتکلم

(۴) ابوالحسن الدقیقی الحلوانی

یہ مذہب بھی تقریباً پانچویں صدی کے نصف تک جاری وساری رہا اور پھر دم توڑ گیا۔

تقلید کا شیوع، جمود اور اس کے اسباب:

تاریخ سے واقفیت رکھنے والے یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ سلطنت عباسیہ کے کمزور ہونے کے سبب عالم اسلام کے صرف سیاسی حالات ہی دگرگوں نہ ہوئے بلکہ دینی وفکری حالات بھی ابتری کا شکار ہو گئے۔ عبدالرحمن الداخل نے اندلس میں خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔

شمالی افریقہ میں شیعہ اسماعیلیہ نے اپنی الگ خلافت قائم کر لی جو دولت فاطمیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ چنانچہ عبیداللہ المہدی الفاطمی امیر المومنین کہلایا جانے لگا۔ مصر میں محمد الاخشید اور موصل اور حلب میں ابوحمدان الگ اپنی حکومت قائم کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ خطبہ بنو عباس ہی کا پڑھواتے تھے۔ یمن میں زیدی شیعوں نے اپنے قدم جما لیے تھے۔ اور خود بغداد میں بنی بویہ نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی اگرچہ برائے نام دولت عباسیہ کا نام باقی تھا۔ اس طرح سارا عالم اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا ظاہر ہے اس سب کا نتیجہ صرف بغض وحسد ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، اس کے لیے نئی نئی سازشیں تیار کرنے سے لے کر اس کو ختم کرنے میں ساری انرجی لگائی جا رہی تھی۔

ایسے حالات میں آل سلجوق نے اٹھ کر سارے مشرق پر اپنا تسلط جما لیا۔ سوائے مصر اور افریقہ کے کچھ علاقوں کے انہوں نے سارے عالم اسلام کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ لیکن ان کو دوام نصیب نہ ہوا کیونکہ داخلی وخارجی قوتیں ان کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ اتابک اور خوارزم شاہ، بربر وغیرہ کی قوتیں بھی اسی طرح بڑھیں اور زوال پذیر ہو گئیں اور ہلاکو خان نے ان تمام قوتوں کو تباہ وبرباد کر دیا۔

سیاسی قوت کے زوال کے ساتھ ہی فکری ودینی قوتیں بھی زوال پذیر ہو گئیں اور مسلم علماء وفقہاء میں پہلے جیسی جرأت اظہار اور خود اعتمادی باقی نہیں رہی جو پیش رو ائمہ وفقہاء میں تھی وہ قوت روحانی اور قوت خود اعتمادی جس کے بل بوتے پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے ھم رجال ونحن رجال کا نعرہ لگایا تھا۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ نے ما من احد الا یوخذ من قولہ و یرد الا صاحب ھذا القبر کا اعلان کیا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے اذا صح الحدیث فھو مذھبی کا نعرہ دیا تھا اور امام احمد بن حنبل نے لا تقلدنی ولا تقلدن مالکا ولا اباحنیفہ ولا الاوزاعی بل خذ من حیث اخذوا کا فیصلہ دیا تھا۔

اس خود اعتمادی اور جرأت گفتاری کی جگہ اب تقلیدی عنصر نے لے لی تھی اور اس زمانہ کے لوگ بلند خیالی، رفعت فکر اور ندرت خیال کے بجائے تقلید پر راضی ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

تقلید سے ہماری مراد وہ روش ہے جو قدیم روش کے مقابلہ میں اس دور میں ایجاد ہوئی۔ اب تک یہ ہوتا تھا کہ احکام شریعت کتاب وسنت سے اخذ کیے جاتے تھے لیکن اب لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ سے کسی ایک ہستی کو امام معین اس طرح بنا لیا کہ احکام شریعت اب اس سے اخذ کیے جانے لگے بالکل اسی طرح جس طرح صاحب شریعت کے احکام ہر مسلم پر مثل فرض وواجب ہیں۔ ایسے ہی یہ مان لیا گیا کہ ہمارے اوپر فلاں امام کی تقلید کرنا یعنی ہر معاملہ میں ان سے پوچھ کر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر ان کی بات سے قرآن وسنت کے نصوص ٹکراتے ہیں تو ٹکراتے رہیں ہم یہ کہیں گے کہ یہ نصوص ضرور ہمارے امام

کے پیش نظر تھے اس کے باوجود انہوں نے اس کے خلاف حکم دیا تو ضرور یا تو یہ منسوخ ہے یا مؤول ہے یا کوئی دوسرا نص اس نص سے زیادہ قوی راجح ہے ورنہ امام اس کی مخالفت کیوں کرتے؟

تقلیدی روش اس سے قبل بھی تھی لیکن اس دور میں اور اس دور میں بڑا فرق ہو گیا پہلے ایسا ہوتا تھا کہ جو لوگ عالم نہیں تھے اور نہ کتاب و سنت سے مسئلہ مستنبط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اگر ان کو کوئی مسئلہ در پیش ہوتا تو وہ کسی بھی عالم سے اس کے بارے میں پوچھ لیا کرتے تھے اور جو وہ بتاتا اس پر عمل کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اب جو تقلید کی ہوا چلی اس میں دو تبدیلیاں ہوئیں۔ اب تک صرف جاہل اور عوام ہی تقلید کرتے تھے اب عالم و جاہل دونوں برابر ہو گئے۔ یہ بھی مقلد وہ بھی مقلد۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ اب تک کسی خاص عالم یا امام سے پوچھنا ضروری نہ تھا کسی بھی عالم سے پوچھ لیا جاتا تھا لیکن اب خاص عالم سے ہی پوچھنا ضروری ہوا اور اس طرح میرا امام تیرا امام کا جھگڑا کھڑا ہوا اور دن بدن حالت خراب ہوتی چلی گئی۔

اب تک علماء جب تحصیل علم کے لیے نکلتے تو پہلے قرآن و سنت کو پڑھتے ان کا علم حاصل کرتے اور جب اس میں مہارت تامہ حاصل ہو جاتی تو اقوال رجال فتاوی صحابہ و تابعین تبع تابعین میں مشغول ہوتے تھے لیکن اب یہ ہوا کہ کسی خاص امام کی کتاب اور اس کے مذہب کی کوئی کتاب فقہ اصلی مقصود ٹھہری۔ امام کی خاص کتاب ان کا طریقہ خاص مقصود اصلی قرار پایا۔ جب یہ حاصل کر لیتا تو مجتہد اور فقیہ کہلانے لگتا۔ اگر اس کی طبیعت کچھ لکھنے پر مائل ہوتی تو پرانی کسی کتاب کا اختصار یا اس کی شرح یا مختلف کتابوں کے مسائل کسی ایک کتاب میں جمع کر دیتا۔ اس کو ہرگز اس بات کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ کسی مسئلہ میں جس میں امام نے کوئی فیصلہ دے دیا ہے اس کے نزدیک وہ غلط ہی ہو اس کو غلط کہے یا اس کے مقابلے میں کوئی نئی بات کہہ سکے۔

حد تو یہ ہے کہ علامہ ابو الحسن عبید اللہ الکوفی الحنفی الاصولی نے اپنی کتاب اصول الکرخی میں صاف صاف لکھ دیا کہ کل آیت تخالف ما علیہ اصحابنا فھی مؤلۃ او منسوخۃ و کل حدیث کذلک فھو مؤول او منسوخ اس طرح کتاب و سنت کو پس پشت ڈال دیا گیا اور اقوال امام اور تفریعات فقہیہ اصل اصول ٹھہریں اور اس طرح اسلام کی وسعت کو محدود کر دیا گیا قرآن کے بیان تبیانا لکل شیء کو نظر انداز کر دیا گیا احادیث و قرآن کو محض ثواب کے لیے پڑھا جانے لگا۔

اس دور کے علماء نے کسی نہ کسی امام کو لازم پکڑ لیا نہ اس سے ایک قدم آگے جائیں اور نہ پیچھے انہیں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ صلاحیتیں انہیں دے رکھی ہیں ان کو اپنے امام کے مذہب کو پختہ کرنے اور اس کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں لگایا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ حضرات ان ائمہ کرام کے بارے میں عصمت

کے دعویدار ہیں جب کہ ان ائمہ نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم سے غلطی ہو جاتی ہے اس لیے قول قدیم و قول جدید کی اصطلاح بھی رائج ہے۔ وہ خود اعلان کرتے ہیں۔ اذا صح الحدیث فھو مذھبی، اور اضربوا قولی علی الحائط، ان اعترافات و فرامین کے ہوتے امام کرخی کا قول اور اس پر عمل کس قدر جرأت بیجا ہے۔

تقلید کیسے شروع ہوئی:

معاصرت سبب منافرت ہوتی ہے کچھ صلاحیتیں بھی کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ فقہاء جب کسی بات میں فتوی دیتے تو دوسرے فقہاء اس کا رد کرتے کبھی کبھی یہ نزاع اس قدر بڑھ جاتی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی ایسے میں کسی قدیم فقیہ یا عالم کا قول جب پیش کیا جاتا تو اس پر بات فیصل ہو جاتی۔ اس طرح علماء متقدمین کے اقوال و آراء پر اعتماد بڑھ گیا اور ان سے سند لینے اور اس پر عمل کرنے کی عادت پڑ گئی۔ رفتہ رفتہ یہی طریقہ اصل اسلام کا طریقہ قرار دے دیا گیا اور اس کے برخلاف قدیم طریقہ کو چھوڑ دیا گیا۔

(۲) ایک سبب یہ بھی ہوا کہ زمانہ قدیم میں خلفاء ہی قاضی اور حاکم ہوتے تھے۔ تیز وہ دیندار اور تقوی شعار بھی ہوتے تھے۔ جب خلفاء کا دور ختم ہوا تو زمام اقتدار دوسرے لوگوں کے ہاتھ آئی جو نہ تو اتنے دیندار تھے اور نہ تقوی شعار۔ ان کے اندر علم کی بھی کمی تھی اور اسلامی حکومت کا دائرہ حکومت بھی بڑھ گیا تھا۔ اس لیے امراء نے بعض علماء و فقہاء سے اس بارے میں مدد لی اور ان کو قاضی بنایا لیکن بعد کے ادوار میں ان قاضیوں کے فیصلوں پر عوام و خواص کو وہ یقین نہ ہو پاتا تھا جو ہونا چاہیے کیوں کہ ان کے بعض فیصلے نفسانیت اور انتقام سے متاثر ہوتے تھے۔ اس لیے قاضیوں کے فیصلہ کو اعتبار اس وقت تک حاصل نہ ہوتا تھا جب تک وہ قدیم علماء و فقہاء یا ائمہ سے سند نہ لائیں اور اس طرح ائمہ کی باتوں کو پیش کرنے کی عادت پڑ گئی آگے چل کر قرآن و سنت سے استدلال یکسر ختم ہو گیا صرف امام مذہب کے اقوال یا اس کے اصول پر نکالے ہوئے اقوال کو پیش کیا جانے لگا اور یہی عادت تقلید کو ذہنوں میں بٹھانے کا باعث بن گئی۔

(۳) ایک سبب یہ بھی تقلید کے جاری کرنے کا ہوا کہ لوگوں میں قرآن و سنت کی تعلیم کم ہو گئی اور اماموں کی کتابوں، ان کے مختصرات اور مجموعوں کو لوگ یاد کرنے لگے اور انہی سے فتوی پوچھا جانے لگا جواب میں وہ امام کا قول ذکر کرتے رفتہ رفتہ یہ عادت اتنی پختہ ہوئی کہ اگر کسی نے جواب میں کوئی آیت یا حدیث پیش کی تو لوگ اس کو تعجب سے دیکھنے لگے۔

(۴) تقلیدی روش کے عام ہونے میں سب سے قوی سبب یہ ہوا کہ انسان فطری طور پر حکمراں طبقہ کی نقالی کرتا ہے اور حکمراں طبقہ کے اعمال و افعال تقالید و عادات اختیار کرتا ہے چونکہ عموماً حکومت

مقلدوں کے ہاتھوں میں رہی اس میں خاص طور سے احناف کے ہاتھوں میں اس کے سبب رعایا نے بھی یہی مذہب اختیار کیا جیسا کہ مشہور ہے الناس علی دین ملوکھم۔

(۵) تقلیدی روش کو فروغ دینے میں بادشاہوں اور امیروں کی اس عادت نے کافی کام کیا کہ عہدے اور مختلف قسم کی سرکاری نوکریاں اپنے ہم مذہبوں کو دی جاتی تھیں جس کے لالچ میں لوگ اپنے حکمرانوں کے مسالک کو قبول کر لیتے تھے۔

(۶) تقلید کے شیوع میں ایک بڑا سبب اس رجحان کا بھی رہا کہ اگر حکمراں طبقہ کا مذہب قبول کریں گے تو رعایتیں تو ملیں گی ہی امن و عافیت بھی نصیب ہوگی ورنہ آفات و بلیات کے ساتھ ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلام کوئی بانجھ مذہب نہیں جس میں صرف چار امام ہوئے اور بس ہمیشہ کے لیے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

بلکہ اسلام میں سیکڑوں امام تام الشروط اور کامل الفقہ والافہام ہوئے لیکن جیسا کہ زمانہ کی روش ہے کسی کو مواقع میسر ہوتے ہیں کسی کو نہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(فای مذهب كان اصحابه مشهورين ووسد اليهم القضاء و الافتاء واشتهر تصانيفهم في الناس و درسوا درسا ظاهراً، انتشر في اقطار الارض ولم يزل ينتشر كل حين. ولم يرغب فيهم الناس اندرس بعد حين (حجة الله. الفرق بين اهل الحديث واهل الراى.)

یعنی جس مذہب کے اصحاب مشہور ہوئے اور خدمت قضاء و افتاء ان کے سپرد ہوئی اور ان کی تصانیف لوگوں میں مشہور ہوئیں اور لوگوں نے ان کو پڑھا پڑھایا وہ اطراف عالم میں پھیل گیا اور برابر پھیلتا رہا اور جس مذہب کے اصحاب کو شہرت نہ مل سکی اور قاضی و مفتی نہ بنائے گئے اور لوگوں کو ان کی طرف رغبت نہ ہو سکی وہ مذہب کچھ دنوں کے بعد مٹ مٹا گیا۔

فقہی مسالک کے منفی اثرات:

ا۔ فقہی مسالک کے سبب امت میں فرقہ بندی کی بیماری پیدا ہوئی اور دلوں میں نفرت، کدورت، عداوت بغض و حسد پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں شہر ویران ہو گئے۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل گئیں زرخیز بستیاں کھنڈرات میں تبدیل ہو گئیں۔

چند نمونے جو تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ رکھے ہیں ملاحظہ ہوں۔

ا۔ یاقوت حموی صاحب معجم البلدان ایران کے سرسبز شاداب شہر اصفہان کی شان و شوکت جو

...الکامل میں بھی اس کا تذکرہ کرکے افسوس کے ساتھ لکھتا ہے:

شوافع و احناف کے مابین کثرت فتن، مسلکی تعصب اور مسلسل خونی تصادم کے باعث شہر میں عام ویرانی کا منظر ہے جب بھی کوئی گروہ غالب آتا ہے دوسرے گروہ کے محلوں میں بغیر کسی رو رعایت کے لوٹ، مچاتا اور آتش زنی کرتا ہے شہر اصفہان کے علاوہ یہی حالت اس کے مضافات کی بستیوں کی بھی ہے۔ معجم البلدان (۱/۲۰۹)

یاقوت حموی شہر رے میں ۶۱۷ھ میں وارد ہوتا ہے اور شہر کا آنکھوں دیکھا حال لکھتا ہے:

شہر کے باشندے تین گروہ میں منقسم تھے شوافع، احناف، شیعہ۔ شوافع کی تعداد کم احناف کی زیادہ اور شیعہ سیاسی غلبہ کے مالک تھے۔ ابتداء شوافع و احناف نے مل کر شیعوں کو تباہ و برباد کیا کہ ان کو وہاں سے نکال کر چھوڑا اور جب شوافع و احناف رہ گئے تو یہ دست و گریباں ہو گئے۔

شوافع اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر جنگ و جدال میں حنفیوں پر حاوی رہتے۔ دیہات کے احناف مسلح ہو کر شافعیوں پر حملہ آور ہوتے اور خوب خوں ریزی ہوتی مگر نتیجہ یہ نکلا کہ شہر میں صرف کچھ احناف اور کچھ شیعہ ہی بچ سکے جنہوں نے تنگ و تاریک گلیوں میں سکونت اختیار کر لی اور اپنے مذہب کو چھپایا ورنہ سب فنا کے گھاٹ اتر جاتے۔

یہ صرف دو شہروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تاریخ کی معتبر ترین کتابوں البدایہ والنہایہ، سیر اعلام النبلاء، وفیات الاعیان وغیرہ کے مطالعہ سے ایسے ایسے خونی واقعات اس مذہبی فرقہ بندی تنفر اور کدورت سے وجود پذیر ہوئے کہ آج بھی اسلام سے محبت رکھنے والے کی آنکھیں ہی نہیں سر بھی شرم سے جھک جاتا ہے۔

علامہ رازی، علامہ عبد الغنی مقدسی، نیز قاضی بغداد محمد ابن الاکفانی حنفی کے ساتھ متعصب مقلدوں نے کیا کیا تاریخ آج بھی بتانے کے لئے تیار ہے۔

(۲) فقہی مسالک کے سبب اللہ کے مقدس گھر بھی فتنہ و فساد سے محفوظ نہیں رہے۔ قرآن و سنت نے نماز کے فریضہ کو جماعت سے ادا کرنے کا حکم دیا اور قیام صلاۃ کو جماعتی زندگی کے لئے ضروری قرار دیا مگر اس گروہی عصبیت کے سبب مسالک کے ٹھیکیداروں نے مساجد کو جنگ و جدل کا میدان بنا دیا کون کس کے پیچھے نماز پڑھے کون نہ پڑھے یہ فتوی صادر کئے گئے چنانچہ مشہور حنفی عالم علامہ ابن الہمام فتح القدیر (۱/۸۹) میں نقل کرتے ہیں:

ابوالیسر نے کہا کسی شافعی امام کے پیچھے کسی حنفی کی نماز نہیں ہوتی دلیل میں لکھا کہ مکحول نسفی نے اپنی کتاب اشعاع میں لکھا ہے کہ رفع الیدین عمل کثیر ہے جس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

مشہور فقیہ قاضی خاں نے شافعی امام کے پیچھے نماز درست ہونے کے لیے یہ شرط لگائی کہ وہ متعصب نہ ہو، انا مومن انشاء اللہ نہ کہتا ہو اور اختلافی مسائل میں احتیاط برتتا ہو۔

شافعی بھی پیچھے کیوں رہتے انہوں نے بھی فتویٰ صادر کیا۔ حنفی کے پیچھے شافعی کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ وہ وضو میں وجوب نیت کا قائل نہیں۔ علامہ القرائی کے بقول اگر وہ نیت کرتا بھی ہے تو بھی نماز درست نہ ہوگی کیونکہ وہ وجوب نیت کا قائل نہیں۔

اگر وضو کرنے کے بعد کسی حنفی امام نے عورت کو چھو دیا تو اس کے پیچھے بھی نماز درست نہ ہوگی شافعی اس کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ تفصیل المجموع معنوی (۱۸۴/۴) دیکھیے۔

(۳) فقہی مسالک کے سبب ہی خانہ کعبہ جو اللہ کا گھر اور تمام مسلمانوں کا قبلہ ہے جس میں صرف ایک مصلی مصلا ابراہیم تھا۔ اس کو چار مصلوں میں بانٹ دیا گیا اور خانہ کعبہ میں ایک نماز چار الگ الگ وقتوں میں ہونے لگی۔ ایک مذہب والا نماز پڑھتا دوسرا بیٹھا تماشا کرتا رہتا۔

اس سے بڑھ کر اس مسلکی گروہ بندی کی نحوست اور کیا ہوگی کہ اسلام میں شہادتین کے بعد جو عبادت سب سے اہم تھی مسلمان اس کو بھی ایک ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے۔

(۴) اس مسلکی گروہ بندی نے مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی بستیاں ویران ہوئیں اللہ کے گھر ویران ہوئے، سماج و معاشرہ کو بھی اس قدر نفرت وعداوت کا شکار بنایا گیا کہ ایک مسلک کے لڑکے کی شادی دوسرے مسلک کی لڑکی سے نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ کوئی حنفی شافعی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا سبب پوچھا گیا تو جواب عنایت ہوا کہ ہمارے اور ان کے ایمان میں فرق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم حقیقت میں مومن ہیں اور شافعی کہتے ہیں کہ ہم انشاء اللہ مومن ہیں گویا ان کو شک ہے لہٰذا ان کے ساتھ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب البحر الرائق ملاحظہ کریں:

ایک مفتی جو خیر سے مفتی الثقلین کے لقب سے موسوم ہیں وہ عنایت کرتے ہوئے نکاح کی اجازت دیتے ہیں لیکن کیا کہہ کر فرماتے ہیں شافعی عورت کو اہل کتاب کی لڑکی مان کر نکاح درست ہو جائے گا۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو فقہاء کی کتابوں کی زینت ہیں اس وقت ہمارے معاشرہ میں کیا ہو رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مسلک کی تبدیلی کے سبب بے رشتے بگڑ جاتے ہیں طلاقیں کرا دی جاتی ہیں اور بچوں کا ہوا دنگ کر دیا جاتا ہے اور یہ سب دین کے نام پر ہوتا ہے جو درحقیقت کرشمہ کاری ہے اسی مسلکی گروہ بندی کی۔

(۴) اس مسلکی گروہ بندی نے مسلمانوں کو کس حد تک منتشر کیا اور ان کی جمعیت کو کس حد تک پارہ پارہ کیا اس کا اندازہ اس سے بھی لگائیے حاشیۃ الطحاوی علی مراقی الفلاح ص ۲۵ میں ایک مسئلہ لکھا گیا ہے۔

اگر کسی کنوئیں میں کوئی جانور گرا، گر کر مر گیا اور پھول گیا، اتفاق سے کسی حنفی نے اس سے آٹا گوندھ دیا اب کیا کریں؟ کیا اس کو استعمال کر سکتے ہیں؟ جواب دیا ہے کہ اس آٹے کا استعمال درست نہیں کتوں کو ڈال دے یا چوپایوں کو کھلا دے۔ بعض فقہاء نے فرمایا کہ کسی شافعی کے ہاتھ فروخت کر دے۔ گویا شافعیوں کا درجہ چوپایوں اور کتوں کے برابر ہو گیا۔

(۵) مسلکی گروہ بندی نے مسلمانوں کو منتشر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

میزان الاعتدال گواہ ہے کہ دمشق کے حنفی قاضی محمد بن موسیٰ البداساغونی فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرا بس چلے تو میں شافعیوں سے جزیہ وصول کروں۔

ان صاحب کے تعصب کو ملاحظہ کریں شافعیوں کو ان حضرت نے مسلمان تک ماننے سے انکار کر دیا۔

اس گروہی عصبیت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے اور ان کے نام پر جھوٹ باندھنے سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ اپنے امام کی تعریف اور دوسرے امام کی تنقیص میں خوب خوب حدیثیں گھڑیں۔

چنانچہ بعض حنفیوں نے حضرت الامام ابو حنیفہؒ کی فضیلت میں یہ احادیث گھڑیں۔

(۱) یکون فی امتی رجل یقال لہ ابو حنیفہ ھو سراج امتی

(۲) ان سائر الانبیاء یفتخرون بی وانا افتخر بابی حنیفہ من احبہ فقد احبنی ومن ابغضہ فقد ابغضنی

(۳) لو کان فی امتی موسیٰ و عیسیٰ مثل ابی حنیفۃ لما تھودوا ولما تنصروا

(۴) سیاتی بعدی رجل یقال لہ النعمان بن ثابت الکوفی ویکنی بابی حنیفۃ لیحیین دین اللہ و سنتی علی یدہ

(۵) یخرج فی امتی رجل یقال لہ ابو حنیفۃ و بین کتفیہ خال. الخ

(۶) الا انبئکم برجل من کوفتکم ھذہ یکنی بابی حنیفۃ قد ملئ قلبہ علما و حکمۃ

یہ احادیث تو حضرت الامام عالی مقام کی فضیلت میں گھڑیں اور حضرت الامام محمد بن ادریس الشافعی رحمۃ اللہ کی مذمت اور برائی میں یہ حدیث گھڑی۔

(۱) یکون فی امتی رجل یقال لہ محمد بن ادریس وھو اضر علی امتی من ابلیس ویکون فی امتی رجل یقال لہ ابو حنیفہ سراج امتی ھو سراج امتی۔

شوافع نے فقہ حنفی پر مشتمل ایک نماز ترتیب دی اور دعویٰ کیا کہ یہ حنفی نماز ہے۔ تفصیل کے لیے امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی کی کتاب مغیث الخلق فی ترجیح المذہب الحق دیکھیں اور پھر اندازہ لگائیں کہ یہ کس چیز کی کرشمہ کاری ہے۔

(۷) اگر بغض و حسد، کبر و غرور، غیبت و چغل خوری، لوگوں کے عیوب کی پردہ دری، شماتت اعداء کی خو، حق کا انکار، ریاکاری اسلام میں اور انسانی معاشرہ میں شریفوں کے نزدیک نہایت بری عادتیں ہیں تو یہ بھی جان لیں کہ یہ عادات و اخلاق پیدا ہوتے ہیں اس مناظرہ بازی کے نتیجہ میں جن کو مسلکی گروہ بندی جنم دیتی ہے اور اس پر فخر و غرور کرتی ہے۔

(۸) مسلکی گروہ بندی کے علمبردار آج یہ کہتے نہیں تھکتے کہ چاروں مسلک برحق ہیں اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

لیکن یہی حضرات ہیں جنہوں نے ماضی میں ائمہ کرام کی توہین میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنے امام کو اٹھایا اور دوسرے امام کو گرایا۔

حضرت امام شافعیؒ کو ایسے جہل میں مبتلا بتلایا کہ روز قیامت ان سے باز پرس ہوگی اور ان کی جہالت قابل معافی نہیں۔ کافر، باغی، معتزلی اور مبتدع کو امام شافعی کے ساتھ کر دیا۔ اگر یقین نہ آئے تو نور الانوار ص ۲۰۰، انوار محمدی پر پڑھ دیکھئے۔

(۹) اسی گروہی و مسلکی عصبیت نے کتاب و سنت کو پس پشت ڈلوایا اور کتب ائمہ کو اصل الاصول بنا کر دین اسلام کو زبردست نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے قاضی وقت نے صاف صاف کہہ دیا تو مرد مقلدی تراز حدیث چہ کار قول ابو حنیفہ بیار۔

(۱۰) ان مسلکی عصبیوں نے عوام و خواص کو جس طرح کتاب و سنت سے دور رکھا اور مدار عمل کتب فقہ قرار پائیں ایسے ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک لوگوں کو نہیں پہنچنے دیا۔

حد تو یہ ہے کہ کوئی شخص عالم ہو یا جاہل فقہ کی کسی بھی بات پر عمل کرنے کو کوئی خطرہ نہیں ہاں وہ کسی حدیث پر عمل نہیں کر سکتا اس پر عمل کرنے کے لیے امام یا فقیہ سے پوچھنا پڑے گا کیا یہ مذاق نہیں ہے کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی احترام ہے جس کے ہم دعویدار ہیں اور اسلام ہم سے چاہتا ہے۔

ائمہ کرام کی ہدایتوں کے برخلاف ہم نے قرآن و سنت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں ان رکاوٹوں کے سبب ہماری ہمتیں ٹوٹ چکی ہیں حوصلے سرد ہو گئے اور ہم مجبور مقلد محض بننے پر راضی ہو گئے۔

منفی اثرات اور خاتمہ:

ان گونا گوں منفی اثرات کے ہوتے ان فقہی مسالک کو کسی درجہ میں مفید کہنا بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس ناطے سے دیکھیں کہ ائمہ دین نے کتاب و سنت اقوال و فتاوی و اقضیہ صحابہ و تابعین کو ملحوظ رکھتے ان کو سمجھنے سمجھانے ان میں تطبیق دینے تعارض کو دفع کرنے اور جدید حالات میں ان نصوص سے استخراج و استنباط مسائل میں کس قدر مشقتیں برداشت کیں دین کو نکھارا اور اس کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اب جدید حالات و حادثات میں دین سے روشنی حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا تو ان حضرات کے لیے ہماری زبانوں سے دعا ہی نکلتی ہے۔

اگر ہم ان ذوات ائمہ کے ساتھ بعد والوں کے تعصب بیجا کو نظر انداز کر دیں مسلم امہ کے انتشار میں فقہی جمود اور باہمی منافرت کو بھلا سکیں تو یقیناً ان مسالک نے وہ کام کیا کہ دنیا کی کسی امت یا قوم نے نہیں کیا۔ اب بھی اگر ہم ان فقہی مسالک کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان ائمہ کرام کے ارشادات و فتاویٰ کو اس نظر سے پڑھیں کہ یہ سب حضرات ہمارے لیے قابل احترام شخصیتیں ہیں۔ ان کی مخلصوں کی قدر یہی ہے کہ ہم بلا درجہ کیے بغیر سب سے استفادہ کریں اور سب کو یکساں احترام دیں۔ قرآن و سنت کی وضاحت میں ان کی مساعی جمیلہ سے بھرپور استفادہ کیا جائے لیکن ان کے ارشادات کو وہ مقام نہ دیں کہ اس پر مزید بحث کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ان کے فیصلوں کو وقتی اور حالات کے تقاضوں کے متعلق دیتے ہوئے مناسب فیصلے تو مانیں لیکن دائمی و ابدی استناد کی حیثیت صرف کتاب و سنت ہی کو حاصل ہونی چاہئے۔

ائمہ اسلام کا طریق فہم و تفہیم میں نہ صرف معاون ہے بلکہ وقت کے تقاضوں کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔

ائمہ دین نے اپنے اپنے وقتوں میں دیگر ائمہ سے اختلاف کیا اس کے پس پردہ وہ تقاضے تھے جو وہ معاشرہ میں دیکھ رہے تھے۔

ان کا اختلاف برائے اختلاف نہ تھا بلکہ یہ اختلاف اس لیے تھا کہ اصل حکم تک رسائی ہو سکے۔ اس قسم کے حالات اور تقاضے اگر آج بھی موجود ہیں تو اہل علم کو باہم اختلاف کرنے یا متقدمین سے اختلاف کرنے کی اجازت ضرور ہونی چاہئے۔

کسی امام کی محبت و عقیدت یا اپنے اساتذہ کی محبت و عقیدت ہمیں ایسا اندھا نہ کر دے کہ ہم دوسروں کے عیوب ٹٹولنے میں لگے رہیں اور دوسروں کے علم و فہم سے لے کر دین و ایمان تک کو اپنے حملوں کا نشانہ بنا دیں۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اماماں دین خصوصاً ائمہ اربعہ ومحدثین عظام کے علم وفضل نہ ہماری تعریفوں کے محتاج ہیں اور نہ ہی ہماری تنقیص سے ان کی شان میں کوئی فرق آتا ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ حضرات ائمہ حدیث رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ کوئی ان کا دفاع کرنے یا ان کی شان بڑھانے کے لیے دوسرے ائمہ فقہ یا حدیث پر زبان طعن دراز کرے۔ یہ سب حضرات اسلام کے سچے خادم رسول کے تابع فرمان اور ہمارے سردار اور محبوب ہیں۔ اللہ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلائے اور ان کے زمرے میں اٹھائے۔ آمین

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین۔

☆☆☆

دعوت دہلی کی آئندہ خصوصی اشاعت

اسلامی معیشت (موجودہ مالی نظام کے تناظر میں)

● کیا اسلامی معاشی نظام موجودہ مالی نظام کا متبادل ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو اس کے اصول وضوابط کیا ہوں گے؟ ● اسلامی نظام بینکاری کیا ہے؟ کیا یہ موجودہ سسٹم کے اندر رہتے ہوئے کام کرے گا یا ایک آزاد نظام ہوگا؟ ● موجودہ مروجہ نظام بینکاری کی شرعی حیثیت؟ ● اسلامی نظام معیشت کے ساتھ ماہرین معاشیات کا رویہ؟ ● اسلامی بینکاری کے قیام کے امکانات، اندیشے اور رکاوٹیں ● موجودہ معاشی بحران کے اسباب؟ ● اشتراکی نظام معیشت کیوں ناکام ہوا؟

تاریخ اشاعت، قیمت، صفحات اور دیگر تفصیلات کا عنقریب اعلان کیا جائے گا

دعوت کے بعض خصوصی شمارے دفتر میں موجود ہیں۔ یہ خصوصی شمارے بہت محدود تعداد میں موجود ہیں، موجود خصوصی شماروں کی فہرست و تفصیلات ۱۳ / جون سہ روزہ دعوت کے شمارے میں ملاحظہ کریں۔

ڈی ۳۲۰-۳۱۲ دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵، فون نمبر 26949639, 26949430
Email:. managerdawat@gmail.com, dawatnews@indiatimes.com www.dawatonline.com

اتحاد امت کی بنیادیں
موانع ومشکلات اور آئندہ کا لائحہ عمل

مولانا عطاء الرحمن وجدی

برادران عزیز! ہم اس وقت کہاں کھڑے ہیں ہمارے مد مقابل کون ہے بلکہ کون کون ہیں؟ ہمارے اور اغیار کے مابین طاقت کا تناسب کیا ہے اس دور میں کون سے اور کیسے کیسے ذرائع ووسائل مستعمل ہیں، حق وباطل کی کشمکش یعنی معرکہ اسلام وجاہلیت کہاں کہاں اور کتنے محاذوں پر برپا ہے اور یہ ہماری کہ ہماری اصل ذمہ داری، ہمارا مقصود اصلی اور معیار فتح وشکست کیا ہے؟ اس اصولی حقیقت کے اچھی طرح سمجھے ہوئے کہ: ع

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری

عہد حاضر میں طریق جنگ کی کیا کیا نئی صورتیں ایجاد ہوگئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان ہمارے سوالوں کے جواب اور ان سارے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں ہو سکتی چہ جائے کہ چند لمحات میں یہ کام انجام دیا جا سکے۔ لہٰذا فی الوقت اجمال اور اختصار کے ساتھ صرف چند نکات پیش خدمت ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ برائے نام کوشش ہم سب کے لئے مفید ہو اور اس میں مجھ سے جو تقصیر ہوا سے رب غفور معاف فرمائے۔ آمین سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو جاننا اور تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم اتحاد امت کی منزل سے دور بہت دور کھڑے ہیں ہمارا حال یا تو اس راہ گیر جیسا ہے جسے اپنی جگہ قرار میسر ہو اور نہ وہ آگے بڑھنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس قافلہ کی مثال ہم پر صادق آتی ہے جو منزل مقصود کا ایک مبہم تخیل تو رکھتا ہو مگر راستے کے سنگ میل معلوم ہوں نہ آگے بڑھنے کا سامان اس کے پاس باقی رہا ہو اور اپنے مقام پر ٹھہرا رہنا اس کے لئے موت کا انتظار کرنے جیسا ہو۔ برادران ایمانی! موجودہ صورت حال کا چیلنج ہمیں جو درپیش ہے اس کا مقابلہ کرنا فی الجملہ پوری امت کا کام ہے تنہا کوئی تنظیم وادارہ و ہزار خواہش وکوشش کے باوجود اس کا جواب نہیں دے سکتا مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس مشکل فرض کی ادائیگی کا آغاز سب سے پہلے طبقہ علماء ہی کو کرنا چاہئے۔ آئیے ایک نظر ادھر ڈالتے

چلیں اس کوشش میں اگر کوئی تلخی محسوس ہو تو اس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ مدافعت اور اصلاح دونوں محاذوں پر قابل قدر مساعی کا ظہور ماضی قریب میں ہمارے اہل علم کی جانب سے ہوا ہے ارض عرب سے لیکر برصغیر پاک و ہند اور افریقہ کے گھنے جنگلوں تک ایسی تحریکات کا علم بلند ہوا جن کا مقصود احیائے دین وملت کے سوا اور کچھ نہ تھا ان تحریکات کے وابستگان نے جان و مال کی زبردست قربانیاں دیکر ایک تاریخ مرتب کی۔ ظاہر ہے ایسی تحریکوں کی قیادت ملت کے وہی فرزندان کر رہے تھے جن کا تعلق طبقہ علماء سے تھا۔ مگر یہ تلخ ہے کہ ان کی تائید وحمایت جس حد تک ہونی چاہیے تھی نہ ہو سکی اتنا ہی نہیں بلکہ ان کی راہ روکنے اور تضعیف وتخفیف کرنے والوں میں وہی لوگ نمایاں نظر آتے ہیں جنھیں ان کا بہی خواہ اور پشتیبان ہونا چاہیے تھا اگر ایسا ہوتا تو ان کا دائرہ واثر کہیں وسیع ہوتا اور ان کی خوش انجامی سے عالم اسلام ہی نہیں عالم انسانی بھی استفادہ کرتا لیکن باہم عصریت اور شخصی انا واستکبار جیسی بیماریوں کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

حضرات! ملت کے انتشار کی ایک بڑی وجہ ہماری سیاسی مغلوبیت کے نتیجہ میں مغربی نظام تعلیم کا مسلط ہو جانا ہے جس نے دین و دنیا کی تقسیم کا بیج بو دیا اس شجر خبیثہ نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو ایسے ذہنی سانچے فراہم کئے جن کے ذریعہ انھیں ترقی مغربی ملکوں کا قائل اور فریفتہ بنا دیا گیا اور یہ کہ الحادی و مادی تصورات کا زہر ان کی رگ و پے میں اس طرح اتار دیا گیا کہ وہ زبانی تو یہی کہتے رہے کہ ہم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں مگر عملاً اس طرح دنیا کے پیچھے پڑ گئے جس کا سبق استاد مغرب نے پڑھایا تھا۔ بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا۔ اسی کے ساتھ اس کڑوے سچ کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ ایک طویل عرصہ سے ہمارا دینی نظام تعلیم بھی بے ترتیبی اور عدم توازن کا شکار ہے اور اس بے ترتیبی اور عدم توازن نے بھی ملت کی شیرازہ بندی کو ناقابل تلافی نقصان پہونچایا ہے باطل کے غلبہ نے تو ہماری راہ روکی ہی تھی ساتھ میں ہماری دینی درسگاہوں سے داعی اور مجاہدین بنکر نکلنے والوں کی تعداد سمٹ کر رہ گئی اور ان کا بڑا حصہ دین وملت کے بجائے اپنے اپنے مسلکوں کا ترجمان و پاسبان بن کر رہ گیا۔ اپنے محدود حلقوں کی تعبیرات اور اپنے مخصوص بزرگوں کی عقیدت مندی میں ایسا الجھا کہ کسی وسیع تر ذمہ داری کی ادائیگی کی فرصت میسر نہ آ سکی۔ اس رویہ کی ایک سے زیادہ وجوہ اور محرکات شمار کرائے جا سکتے ہیں۔ خود پسندی اور برتری کے احساس کے ساتھ اپنے اداروں اور تنظیموں کے استحکام کے معصومانہ ارادے بھی دیکھنے والوں کو نظر آتے ہوں گے مگر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ غور کیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ ہمارے دینی مراکز تعلیم کے نظام کی بے ترتیبی اور عدم توازن ہی اس کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ جس نے مؤخر کو مقدم اور فرع کو اصل بنا دیا ہے ہماری انتہائی قابل قدر درسگاہوں میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بنیادی ماخذ کی جگہ پر ترجیح

مسالک اور فقہی وکلامی مباحث کو اولیت واہمیت حاصل ہو گئی ہے اور ایک اصطلاحی علم دین کا مقام ومرتبہ اسی کے واسطے سے متعین کیا جانے لگا ہے۔ اب اللہ اور اس رسول کے دشمنوں کی شرارتوں اور سازشوں کا جواب دینے سے زیادہ کام یہ رہ گیا ہے کہ کس طرح ان اہل اسلام کا مقابلہ کیا جائے جو ہیں تو ہمارے بھائی مگر ہمارے ہم مسلک وہم مشرب نہیں ہیں اس غلط روش کا انجام ہمارے سامنے ہے مزید خطرات وخدشات ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ میرا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ علمی بحث وتحقیق کا دروازہ بند کر دیا جائے اور اس نوعیت کے اختلافات کو زبردستی ختم کر دیا جائے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلہ کو حد سے نہ بڑھنے دیا جائے اور اہل ایمان کے باہمی رشتہ اخوت کا از حد پاس ولحاظ رکھا جائے، نیز عامۃ المسلمین کو ان مباحث میں نہ الجھایا جائے جن کے نہ تو وہ مکلف ہیں اور نہ اس کی استعداد رکھتے ہیں۔ آج کل یہ افسوس ناک تماشا اخباری صفحات کی زینت بنتا جا رہا ہے اور جانے انجانے ذاتی شہرت سیاسی مفادات کے حصول کے لئے بھی ایسا ہوتا ہے۔ حالانکہ ہمارے اہل علم حضرات کو مربی ومزکی کی حیثیت میں اختلافی حدود کی نشاندہی کرتے ہوئے اتحاد بین المسلمین کی ضرورت واہمیت سے آگاہ کرتے رہنا چاہیے تھا۔

علاوہ ازیں امت وملت کے زیر عنوان یہ کڑوا سچ بھی ہمارے سامنے رہنا چاہیے کہ کتاب وسنت کی صریح نصوص کی رہنمائی کے باوجود امت کے سامنے اس وقت کوئی ایسا نصب العین نہیں جس کو قابل حصول سمجھتے ہوئے مرحلہ وار اس کی جانب بڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہو داخلی کمزوریوں اور خارجی دباؤں نے مسلمانوں کو محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے اپنے مفادات کے لئے جس طرح دوسری نسلی اور ملی قومیں اپنے دعوے اور مطالبات پیش کرتی رہتی ہیں امت مسلمہ بھی اسی راستے پر گامزن ہے حتی کہ اپنی اہمیت کو دینے کے لئے جس طرح اوروں کے پاس کچھ نہیں یہی حال ہمارا بھی ہے اور یہ حال اس ملت کا ہے جس کو خیر امت اور اخرجت للناس کا منصب عالی عطا کیا گیا تھا ہم نے امت کے احساس کو ایک تاریخی ورثہ تک محدود کر دیا ہے جس کے تقدس واحترام میں کلام نہیں ہے مگر مستقبل کی منزل ہم نے بھی اہل مغرب کے تصور ترقی کو حق مان لیا ہے یعنی کہنے کو کعبہ ہی ہمارا قبلہ ہے مگر ترقی کی اس گاڑی میں بیٹھ کر ہم اپنا سفر طے کرنا چاہتے ہیں جس کا رخ لندن اور واشنگٹن کی جانب ہے اس دورنگی نے ہمیں بے یقینی اور تشکیک کی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے یہاں تک کہ بعض بے توفیق لوگوں کی نظر میں تو اسلام اور امت کا اپنے جذباتیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لہذا ہمارے ارباب علم کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ امت کے سواد اعظم کو بے یقینی کی اس دلدل سے نکالنے کے لئے اپنی صلاحیتیں اور اپنے اوقات صرف کریں اس نے ہمیں غلامی سے بدتر حالت کو پہونچا دیا ہے چاہے اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے

اس سلسلے میں ہمیں اپنی تاریخ کی ان روشن مثالوں کو سامنے رکھنا پڑے گا جنھیں حسین ابن علی، امام ابوحنیفہ، احمد بن حنبل اور امام مالک جیسے بزرگوں نے جان ومال لگا کر قائم کیا تھا۔

حضرات گرامی! اسلام ایک اجتماعی دین ہے مگر بنیادی اہمیت فرد کو ہی دی گئی ہے، کوئی صالح اجتماعیت صالح افراد کے بغیر نہ تو وجود میں آسکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ قرون اولیٰ اور بعد کے ادوار میں بنیادی فرق یہ نہیں ہے کہ اسلام کا فہم اور علم مفقود ہو گیا، کتاب اللہ کی حفاظت تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمے لے رکھی ہے ہزار خامیوں کے باوجود امت نے سنت نبوی کی حفاظت کا حق بھی ادا کیا ہے بلکہ اصل فرق یا تبدیلی یہ ہوئی کہ کتاب خوانی ہوتی رہی مگر حاملین کتاب دنیا سے رخصت ہوتے رہے اور ان کی جگہ ایسے افراد نے لی جو کتاب خواں تو تھے مگر صاحب کتاب نہ تھے لہٰذا امت کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنانے کے لئے اس نظام تزکیہ کو وجود میں لانا پڑے گا جس کے سائے میں ما تقولون ما لا تفعلون کی بیماری سے شفایابی کا پورا پورا سامان موجود ہو۔ مسلسل شکست وریخت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہمارا نظام تزکیہ وتربیت عالم نزاع میں گرفتار ہے۔ دین کا تعبدی پہلو ایک رسم کی طرح قائم ہے جیسے ایک کمزور قلب حرکت کرتا ہے مگر جسم کو مطلوبہ قوت وحرارت فراہم نہیں کر پاتا۔ شاید اسی لئے علامہ اقبال نے کہا تھا:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

یاد رہے کہ قومی حق تلفیوں اور دشمنوں کی جراحتوں کے رد عمل سے پیدا ہونے والی کیفیت میں اتنا زور نہیں ہوتا کہ اس کی بنیاد پر امت کو متحد رکھا جا سکے اسی لئے تنظیمیں وجود میں تو آتی ہیں مگر قائم نہیں رہتیں جماعتیں بنتی ہیں مگر قیادتیں میسر نہیں آتیں۔ یعنی بقول بدیع الزماں نورسی میں نے مشرق میں ایسی جماعتیں دیکھیں جن کا کوئی امام نہیں ہوتا اور ایسے امام دیکھے جن کے پیچھے جماعت نہیں ہوتی اور ایسے سر دیکھے جو بے مغز تھے اس لئے امت کو متحد کرنے کے لئے صالح افراد کی تیاری اور صالح قیادتوں کو وجود میں لانے کے لئے نظام تزکیہ وتربیت کا قیام لازم ہے۔

بے خبری و بے نظری

برادران محترم! جس طرح ہمارا معاشرہ مومنانہ صفات سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے اور مغربی ثقافت وتعلیم کے تسلط نے اسے غلامی سے بدتر حالت میں پہنچا دیا ہے اسی طرح ہمارے تعلیمی طبقہ کی بے خبری و بے نظری نے اسے قائدانہ صلاحیتوں سے محروم کر دیا ہے۔ کم ہی لوگ ایسے ملیں گے جو زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کوئی نسخہ تجویز کر سکیں، اکثر دشمنوں کی بچھائی ہوئی بساط پر جوابی کارروائی کی حد تک

[illegible] ظاہر کرتے نظر آتے ہیں۔ یعنی اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر ہمارے سامنے اپنے [illegible] قریب ہے یہاں اب تک موجودہ نظام سیاست پر ماہرانہ تنقید نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہم [illegible] کے ساتھ اپنے مقام اور حیثیت کا اندازہ لگا سکے تقریباً یہی حالات پورے عالم کے موجودہ [illegible] کے ہیں کہ وہ دشمن کی چالوں سے بے خبر فراست مومن سے کوسوں دور نظر آتے ہیں، ایک [illegible] سے سو بار ڈسے جاتے ہیں نیک وبد دوست ودشمن کی تمیز سے یکسر نا آشنا لوگ قیادت ورہنمائی کے مناصب پر فائز ہوں تو کسی مستقل اور پائدار اتحاد کی تمنا کیسے پوری ہو سکتی ہے۔ سطور بالا میں جس [illegible] وتربیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے مفہوم میں مطلوبہ صفات کی حامل قیادت کی تیاری [illegible] امر کا وجود رکھتی ہے۔

بے صبری وعجلت پسندی

زوال وانحطاط کے طویل دور سے گذرتے گذرتے ہمارے عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی جو اخلاقی بیماریاں پیدا ہوگئی ہیں اور جنھوں نے ہمارے جسد ملی کو کھوکھلا بنا دیا ہے ان میں ایک مرض عجلت پسندی اور بے صبری کا ہے کسی فرد کی ذاتی زندگی میں بھی اگر یہ گھن لگ جاتا ہے تو اس سے کسی بڑے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی کوئی قوم اس کا شکار ہو جائے تو اس کے عوام تماشائی بن جاتے ہیں اور خواص [illegible] مسلسل کا حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں ان میں یہ ہمت باقی نہیں رہتی کہ عوامی خواہشات سے بے نیاز ہو کر کسی خاص مدت تک منزل کی تلاش میں سرگرم سفر رہ سکیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ قافلے والے تن آسان اور سہولت پسند ہیں تو خود ہی کسی گوشہ عافیت یا شجر سایہ دار کو ہی منزل قرار دیتے ہیں افسوس تین صدیوں کی [illegible]ات اور مایوسیوں نے ہمیں بے صبری میں مبتلا کر دیا ہے اس کے ثبوت میں ہمارا مشاہدہ کافی ہے۔ ہم تحریک خلافت کے باقیات وآثار دیکھتے ہیں اس کے کھنڈرات گواہی دیتے ہیں کہ عمارت کتنی عظیم تھی؟ جس کے بچے ہوئے ملبے سے ہندوستان کی آزادی کی راہ ہموار ہو گئی اس کی بڑی وجہ منصب امامت کا خاتمہ بتایا جاتا ہے لیکن ترک ناداں کے ہاتھ سے خلافت کی قبا چاک ہو جانے کا یہ نتیجہ لازم تو نہیں تھا کہ ہم تصور خلافت کی بساط ہی لپیٹ دیتے اگر اسی دور میں پاپائیت برقرار رہ سکتی ہے اور یہودی ارض موعود کے دعویدار بن کر اٹھ سکتے ہیں تو خلافت کے قیام کی جدوجہد کیوں جاری نہیں رکھی جا سکتی ایک اور تازہ مثال، بابری مسجد کی شہادت کے المیہ کی ہے یہ المیہ رونما ہوا فطری طور پر ہم نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہمارے معتبر رہنماؤں اور اداروں نے اپنا موقف واضح کیا شاید ہی کوئی قابل ذکر ادارہ ہو جس نے اس حق میں فتویٰ نہ دیا ہو مگر حال کیا ہے؟ سب کے سامنے ہے ہم ہر سال اعلان تو کرتے ہیں کہ بابری مسجد سے دست بردار نہیں ہوتے مگر تحریک بازیابی کہاں ہے؟

میرا پختہ خیال ہے کہ اتحاد بین المسلمین کے خواب کی تعبیر فوری طور پر منصۂ شہود پر نظر آنے والی ہے لیکن ہم واقعی اگر اس کے لئے مخلص ہیں تو صبر وضبط کے ساتھ طویل راہوں سے گذر کر اس تک پہونچ سکتے ہیں یا اس لئے بھی کہ اللہ تبارک وتعالی نے ہمیں انھیں احکام کا مکلف قرار دیا ہے جن کی استطاعت بھی ہمیں بخشی ہے اور واعتصموا بحبل اللہ کا حکم بھی اس میں شامل ہے۔

اہل نظر اور باخبر قیادت اگر اپنا کوئی وجود رکھتی ہے تو اس کو عامۃ المسلمین کے درمیان چند اہداف مقرر کر کے ان کے حصول کے لئے جاں فشانی صبر آزمائی کے ساتھ کام کرنا پڑے گا جیسے کہ قطعہ اراضی کے بغیر کوئی چھوٹی بڑی تعمیر ممکن نہیں اسی طرح عوام کے قابل ذکر حصہ کو ہمنوا بنائے بغیر کوئی بڑی اور اصولی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اس لئے کہ افکار ونظریات کا اصل مقابلہ تحریری وتقریری مجلس میں نہیں زندگی کے عملی میدانوں میں ہوتا ہے اور فیصلہ اگرچہ مشیت الٰہی کے تحت ہوتا ہے مگر بظاہر اسباب انسانوں کے ذریعہ اور عمل کی زبان سے ہوا کرتا ہے۔ جن کی اپنی لغت میں کلمہ کن فیکون کی جگہ نہیں ہوتی۔ بلکہ جہد مسلسل سے گذر کر کسی مقصد کو حاصل کیا جاتا ہے۔ جو کچھ سامنے آتا ہے اگرچہ من عنداللہ ہوتا ہے مگر اس کا ایک حصہ من عند انفسکم کے دائرے میں ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے ہدف کے طور پر عامۃ المسلمین کے اسی احساس خودی کو بیدار کرنا ہوگا جسے اپنوں کی سادگی اور غیروں کی عیاری نے درگور یہ کنارہ گور پہنچا دیا ہے۔ اگر ایسا ہو سکا اور ایسا ہونا چاہئے تو سمجھئے کہ قیادت نے عمارت اتحاد کی پہلی اینٹ رکھ دی۔

وما علینا الا البلاغ

☆☆☆

عبداللہ خالد فیصل
ساجد خلیل
PP
Print Point
پرنٹ پوائنٹ
Print Point
Graphic Designing
A best solution for DTP work
Urdu, Arabic, English and Hindi
D-105, (Falahi Chowk) Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی تجربے - ایک جائزہ

ڈاکٹر حسن رضا (رانچی)

آزادی کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ہندوستانی سیاسی کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آزادی کے وقت جو سیاسی منظر نامہ تھا اس کو تازہ کر لیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر نہ حال کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے نہ مستقبل کی تعمیر۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈیڑھ سو سالہ غلامی کے دور میں ہندوستان کا سیاسی ارتقاء مغرب کے زیر اثر ہوا اور آہستہ آہستہ اجتماعی وسیاسی زندگی کے سارے خد وخال مغرب کے سانچے میں ڈھل گئے۔ مثلاً آزادی کا تصور، سیاسی نظریہ، قومی ریاست، ادارے اور طور طریقے سب وہی رائج ہو گئے جو مغرب میں رائج تھے۔ سیاسی زندگی کے اصول، دستوری نظام، اکثریت اور اقلیت کا شعور، سیاسی پارٹیوں کا کردار، الیکشن غرضیکہ پورا طرز جہاں بانی وہیں سے مستعار لیا گیا۔ اگر ہم مغرب کے اس پورے سیاسی تجربے کو ایک الفاظ میں کھنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو سیاسی انقلاب آیا وہ سیکولر قومی ریاست کا وجود secular nation state ہے یعنی سیکولر نیشن اسٹیٹ نے مغربی قوموں میں نیا سیاسی جوش وجذبہ ابھارا۔ ایک نئی توانائی بخشی جس سے تازہ دم اور سرشار ہو کر مغربی قوموں کے اندر اپنے جغرافیائی حدود کو پھلانگ کر نئی نئی کالونیاں آباد کرنے کا سیاسی حوصلہ دیا۔ جس کی کوکھ سے مغربی سامراجیت (استعماریت) نے جنم لیا اور جس کی جدید شکل گلوبل سامراجیت ہے جس میں وہی جبلہ پروردہ ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہیں مغربی سیاسی تصورات نے غلاموں کے اندر بھی نئی سیاسی انگڑائی لینے میں مدد کی اور مغربی سامراجیت کے تحت جو قومیں غلام تھیں انہوں نے بھی آزادی کی لڑائی شروع کی لیکن آزادی کی یہ ساری جد وجہد مغربی سیاسی تصورات کے تحت شروع کی گئی سوائے مسلمانوں کے کسی کے پاس کوئی زندہ سیاسی تصور بھی نہیں تھا۔ نہ سیاسی نظام کا کوئی ایسا متبادل تھا جس سے وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ آزادی حاصل کرنے کے بعد نئی آزاد شدہ قوموں نے سیکولر قومی ریاست کے فریم کے تحت ہی اپنے کو منظم کیا اور اسی رخ پر سرگرم عمل رہے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا تو

اس نے بھی secular nation state کے ڈھانچے میں اپنے شہریوں کی آزادی، اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کا حوصلہ بخشنے کی کوشش کی انسانی تمدن کے ارتقائی سفر میں ریاست اور سیاست کا یہ بالکل نیا چہرہ اور کردار وجود میں آیا۔ گاندھی جی کے یہاں اس نئے چہرے اور سیاسی کردار کی سمجھ کا احساس اس وقت کے تمام سیاسی لیڈروں کے مقابلے میں زیادہ ملتا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنے سیاسی کشمکش والے مضامین میں اس کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ گاندھی جی بھی آزادی ملنے کے بعد گرام سوراج پر زور دینے لگے تھے۔ گرام سوراج قومی ریاست کے دھار کو کند کرنے کی ایک کوشش تھی جو ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا مولانا مودودیؒ نے جدید سیکولر قومی ریاست کے حوالے سے بنیادی سیاسی مسائل پر گفتگو کا آغاز سیاسی کشمکش کے عنوان سے کیا ہے۔ لیکن وہ بحث ملت کے سواد اعظم کی رائے پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ چنانچہ ہندو، مسلمان، سکھ، پسماندہ اقوام اور دلتوں نے مل کر اسی مغربی سیاسی فریم میں آزادی کی جنگ لڑی اور بالآخر کانگریس اور مسلم لیگ نے اقتدار کی ہوس اور رسہ کشی میں ایک nation کے بجائے دو nation state کے قیام پر راضی ہو گئے۔ دونوں کا سیاسی فریم اصلاً مغربی تھا، اور ایشیا میں سازش کے لئے سب سے زیادہ سازگار ثابت ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس ملک کی تعمیر کا vision مختلف تھا۔ لیکن جدید قومی ریاست میں سیکولر سیاسی پارٹیوں کے کردار سے مولانا شاید پوری طرح آشنا نہ ہو سکے یا اس سلسلے میں ان کا ذہن بالکل صاف شفاف نہ تھا۔ چنانچہ آزادی کے قریب جب کانگریس پارٹی ملکی اقتدار میں شامل ہونے لگی تو اچانک جو اس کا کردار سامنے آیا کہ گاندھی جی کو چپ ہو جانا پڑا اور نہرو پٹیل نے ملک کی تقسیم پر آخری فیصلہ کر لیا اور مولانا کی رائے کو قابل اعتنا نہ سمجھا جس کا ذکر ہماری آزادی میں مولانا نے کیا ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی تعمیر نو کے لئے گاندھی کا بھی ایک vision تھا۔ ایک vision مارکسی تھا نہرو جی کے وژن پر بھی سوشلزم کی وارنش چڑھی ہوئی تھی امبیڈکر، لوہیا، جے پی یہ تینوں بھی اپنا اپنا خواب و خیال رکھتے تھے hindutva وژن کے علمبردار ہر جگہ تھے۔ بعد میں باضابطہ سیاسی پارٹی بنا کر اس وژن کے علمبردار سامنے آئے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وقت کوئی اسلامک وژن نہیں ابھر سکا تھا۔ میثاق مدینہ سے اخذ شدہ vision جس پر مولانا آزاد نے بحث کی تھی اور مولانا مودودیؒ نے بھی اس سے مکالمہ کیا تھا وہ بحث آگے نہ بڑھ سکی کہ موجودہ ہندوستان میں سیاسی وژن کی بنیاد بن جائے۔ آزادی کے بعد جو قیامت گذری۔ تقسیم ملک نے مسلم ملت کے دروبام سب کو کچھ اس طرح تہہ و بالا کر دیا کہ سارے سیاسی خواب ہی بکھر گئے ان حالات میں شکست خوردگی کے احساس نے شعور کو یک گونہ

مفلوج کر دیا مجھے تقسیم ملک کے حادثات کی تفصیل میں جانا نہیں ہے بس دو باتیں اس سیاسی حادثات کی روشنی میں واضح کرنی ہے۔

(۱) مختلف قوموں کو ایک قوم فرض کر کے مغربی طرز پر بنائی گئی سیکولر جمہوری قومی ریاست کی دھار کیا ہوتی ہے؟

(۲) اس نظریے کے مطابق اس ریاست کو چلانے والی سیکولر پارٹیوں کا کردار کیا ہوتا ہے؟

آزادی کے بعد ۶۲ سالہ سیاسی سفر ان دو باتوں کو تجربے کی روشنی میں پرکھنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ تاریخ نے جو یہ درس مسلمانوں کو دیا ہے انہوں نے آج تک ٹھیک سے نہیں سمجھا۔ چنانچہ وہی قومی ریاست کے فریم میں سیکولر پارٹیوں کے ذریعہ اپنے قومی مفاد کی حفاظت کی کوششیں مختلف سیاسی تجربوں کے نام سے ہوتی رہیں اور بالآخر کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان تجربوں میں سب سے بڑا اور پہلا تجربہ مجلس مشاورت کا ہے جو ۱۹۶۱ء میں مسلم کنونشن کے بعد قائم ہوئی اور جس نے نو نکاتی منشور بھی شائع کیا لیکن ۱۹۶۴ء سے ۲۰۰۹ء کا سفر بتاتا ہے کہ مسلم ملت کے سیاسی مسائل اور سیاسی عزائم کی تکمیل میں ناکامیاب رہی۔ اسی طرح مسلم مجلس، انجمن اتحاد المسلمین، انصاف پارٹی مسلم لیگ، پیرا اور بعض مقامات پر مسلم لیگ کا تجربہ ہے لیکن یہ سارے چھوٹے بڑے سیاسی تجربے ہمارے درد کا درماں نہ بن سکے اور نہ ملک پر کوئی خاص نقش بنا سکے۔

ضرورت ہے کہ ان تجربوں کا تفصیلی مطالعہ معروضی طریقے سے کیا جائے۔ اس وقت ان تجربات کے سرسری مطالعے سے جو باتیں سامنے آتی ہیں ان کا ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں تاکہ آئندہ کے لائحۂ عمل کے لئے یہ نکات کام آ سکیں

(۱) مجلس مشاورت کی سب سے اوپر کی لیڈرشپ ایک سیاسی پارٹی سے وابستہ تھی آئندہ یہ غلطی نہیں ہونی چاہئے آئندہ کوئی بھی سیاسی کوشش ہو اس کی لیڈرشپ میں آزاد شخصیتیں ہوں کسی دوسرے سے ان کی وابستگی نہ ہو اس کا پولیٹکل وژن آزاد ہو کسی سیکولر پارٹی سے مستعار نہ ہو

(۲) لیڈرشپ پارٹ ٹائم نہ ہو کہ اصل ذمہ داری کچھ اور ہو اور وقتاً فوقتاً سیاسی کام انجام دے اور ہنگامی طور پر مصروف رہے۔

(۳) سیاست کا مفہوم صرف الیکشن سیاست تک محدود نہ ہو بلکہ اقتصادی، تعلیمی، سماجی حالات کی اصلاح جس کو people politics کہتے ہیں اس کو ایک ایجنڈے کے تحت مستقل انجام دیا جاتا رہے people struggle سے وابستہ قیادت ہو در بار سے وابستہ نہ ہو۔

(۴) اجتماعی لیڈرشپ کے منصب پر جو لوگ ہوں وہ عملی سیاست کا تجربہ رکھتے ہوں لہٰذا

ضروری ہے کہ مقامی، علاقائی اور ریاستی سطح سے جمہوری سیاسی عمل کو تیز تر کیا جائے تاکہ دوسرے اور تیسرے درجے کی عوامی سیاسی قیادت ابھرے اور پھر صحیح اجتماعی لیڈر شپ وجود میں آسکے۔

مسلمانوں کے اندر ایسی عملی سیاسی لیڈر شپ کا پیدا ہونا ضروری ہے جو تنگ نظری کے ساتھ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی حفاظت پر مصر نہ ہو بلکہ بڑے پیمانے پر انصاف کے مقام سے عامۃ الناس کی حقیقی ترقی اور فلاح کے کاموں سے اسلام اور مسلمانوں کے اصلی و حقیقی مفادات کی خدمت کر سکے۔

(۵) مسلمانوں کی دینی جماعتیں، ادارے، شخصیتیں اور پلیٹ فارم مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں اس طرح حصہ لیں کہ ان کے اندر احتجاجی مزاج، شکوہ شکایت، سیاسی مرثیہ، ماتم اور ردعمل کی سیاست کا مزاج پروان نہ چڑھے۔ بلکہ عملی جدوجہد، اپنی اجتماعیت کی قوت، سیاسی حلیف و حریف کی دور تک سمجھ پیدا ہو۔

ڈاکٹر جلیل فریدی نے اپنے سیاسی تجربے کا نچوڑ اس طرح بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

سیاسی اتحاد، اتفاق کس طرح قائم ہو سکتا ہے جب کہ بہت سے ذہنوں پر پیسے کی لالچ اور عہدہ و منصب کی ہوس مسلط ہے۔ انسانی قدروں کی کسی کو فکر نہیں۔ کسی کے سر میں لیڈر بننے کا سودا ہے کہیں شہرت و قیادت کا شوق ہے۔

سید محمود نے چند بڑے اداروں اور جماعتوں کے لیڈروں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی ہے کہ اگرچہ وہ معروف و مشہور ہیں اپنے اداروں اور اپنی جماعتوں میں اونچی مسندوں پر فائز ہیں۔ معتبر علمی، دینی خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن ان کے اندر سیاسی بصیرت، بر وقت سیاسی فیصلے کی قوت کی کمی ہے اس نے بھی مسلم ملت کے سیاسی تجربے کو نقصان پہنچایا ہے۔ کسی سیاسی تجربہ کار نے صحیح کہا کہ قوت عمل سے محروم جذبہ خدمت سے خالی انسانوں کی بھیڑ مجلس میں آکر واپس چلی گئی۔

آزادی ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی تجربہ میثاق مدینہ سے اخذ شدہ واضح اور صاف وژن کے ساتھ نہیں شروع کیا گیا۔ عملی قیادت کے پنپنے اور بڑھنے کا موقع جمہوری طریقے سے نہیں دیا گیا۔ اوپر سے ٹھونسی ہوئی، ادارہ جاتی، مسلکی اور جماعتی قیادت جو عملی سیاسی تجربے سے خالی تھی وقتی طور پر جذباتی عوام کے ساتھ ملکر عارضی تجربے کا حصہ بنتی رہی۔

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

☆☆☆

ہندوستانی سیاست اور مسلمان

پروفیسر منظور احمد
(سابق وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی)

میں اپنی بات کی شروعات Aesop کی طرح ایک Fable سے کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دن اتفاقاً جنگل میں جمہوریت آگئی۔ جو جانور مستقل تنازع للبقاء (struggle for survival) میں مصروف رہا کرتے تھے انھیں یک بہ یک کرسی کی فکر ہوگئی، شیر تو اپنی طاقت کے زعم میں الگ تھلگ رہا لیکن بچارے بھیڑیے کو بڑی پریشانی لاحق تھی۔ اس نے ہر وقت دوسروں کو ستایا تھا خاص طور سے بھیڑوں پر بہت ظلم کیا تھا اس کا اس جمہوریت میں کیا بنے گا؟ اسے ایک ترکیب سوجھی اور وہ ایک سفید سوتی چادر لپیٹ منھ میں گھاس کا تنکا رکھ کر لیٹ گیا۔ بھیڑوں نے یہ حیرت ناک منظر دیکھا تو کچھ آس پاس جمع ہوگئیں اور بھیڑیا ان سے گویا ہوا: "بھائیو! دیکھو میں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور میں اب تمہاری ہی طرح گھاس کھانے لگا ہوں۔ آخر ہم میں اور تم میں فرق ہی کیا ہے تمہارا نام بھیڑ ہے اور ہمارا نام بھیڑیا ہے دونوں ناموں میں صرف یا کا فرق ہے۔"

یہی صورت حال پندرہ اگست ۱۹۴۷ کو پیدا ہوئی جب برطانوی استعمار کے خدمت گار "امین ہوئی" صدیوں سے تمام استحصال کرنے والے گروہ، ہر حکومت میں فائدہ اٹھانے والے طالع آزما اک یک بہ یک جمہوری قدروں کے پاسبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگے اور بھیڑیوں نے بھیڑوں کی قیادت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کھیل میں بھیڑوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ عجیب بات ہے کہ آدی واسیوں کی تعداد آزادی کے بعد سے متواتر گھٹ رہی ہے ان کی رہائش کے پچاس فیصد سے زیادہ علاقوں سے انھیں خانہ بدر کر دیا گیا ہے۔ ایک بڑی تعداد چمکتے دمکتے شہروں کی تنگ و تاریک گندی بستیوں میں، دوسرے شہروں کی تعمیر و تزئین میں لگی ہوئی ہے اور مسلمانوں کی تعداد وقتاً فوقتاً نسل کشی کے بعد بھی ہمیشہ موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان کے مخصوص سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات تھے۔ جو موجودہ نظام نمائندگی ہے وہ انگلینڈ کی طرح انھیں ممالک میں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں مفادات میں بنیادی تضادات نہ ہوں اور بنیادی مسئلوں پر ملک متحد ہو۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مفادات میں بنیادی تضادات موجود ہوں

وہاں یہ نمائندگی کا نظام بے سود ہے۔ یہاں تو ابھی تک شہریوں کی تقسیم بھی ان کے مذہب کی بنیاد پر کرنے کی کوشش ہے۔ کچھ لوگ مسلمانوں اور عیسائیوں کو برابر کا شہری ماننے سے بھی ببانگ دہل انکار کرتے ہیں اور کلچرل نیشنلزم کے داعیوں کے ڈانڈے بعض طبقات کو حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کے ارادے سے ملاتے ہیں۔

ہمارے یہاں مختلف مفادات تھے جن کی نمائندگی کے لئے ہمیں کثیر رکنی حلقہ انتخاب اپنانا چاہئے تھا۔ لیکن اس نظام میں اونچے طبقے اور حاوی آر، لوگوں کا فائدہ نہیں تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سفارش کو نامنظور کر دیا گیا۔ اس نظام کی انسان دشمنی تو فوراً ہی ظاہر ہو گئی کہ بھیم راؤ امبیڈکر خود ہی الیکشن ہار گئے۔ ظاہر تھا کہ اس نظام میں بعض اوقات درج فہرست ذات و قبائل کے حلقہ انتخاب سے ایسے نمائندے منتخب ہوتے ہیں جنھیں ان طبقات کی حمایت نہیں ہوتی۔ اس طرح نشستیں محفوظ کرنے کی اور ان طبقات کے مفادات کی نمائندگی کرنے کی اس نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ۱۹۶۲ میں قانون بنا کر ہم نے کثیر رکنی حلقہ انتخاب کا نظام بالکل ختم کر دیا۔ کثیر رکنی حلقہ انتخاب میں ایک بڑے حلقہ انتخاب سے کئی نمائندوں کو منتخب کرنے کا نظام تھا جس سے ہر طبقے کے مفادات کی نمائندگی ممکن تھی۔ مسلمانوں کے لئے بھی یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے ایک نمائندے کو منتخب کر سکتے تھے۔ نتیجتاً مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کبھی آدھی نمائندگی بھی نہیں ملی اور پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں ذاتی اور گروہی مفاد (vested interest) چھائے رہے۔

ہمارے سیاسی نظام میں نظریاتی سیاسی پارٹیوں کا سسٹم ٹوٹ گیا۔ روز لوگ پارٹی بدلتے ہیں ایسے بھی بہت سے واقعات آئے ہیں جہاں کمیونسٹ پارٹی کا آدمی بھارتیہ جنتا پارٹی میں چلا جاتا ہے اور کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔ موقع پرست اور طالع آزما افراد اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے، اقتدار پارٹیوں میں آتے جاتے رہتے ہیں نظریاتی طور پر پارٹیوں میں ایسی لچک ہے کہ باہر کے مبصرین کو حیرت ہوتی ہے ایک شخص جو کل تک فرقہ پرست جماعت کا رکن تھا اور ان کی تمام فرقہ وارانہ حرکات میں شامل رہا ہے کسی دوسری سیکولر پارٹی میں آتے ہی سیکولر ہو جاتا ہے۔ ۱۹۹۲ کے مسلم کش فسادات میں جن لوگوں کے ہاتھ کہنیوں تک خون سے رنگے ہوئے تھے وہ کانگریس میں آتے ہی سیکولر ہو گئے۔ جب ۱۹۸۲ میں گجرات کے ایک سیاسی اتحاد میں آدی واسی، ہریجن، مسلمان اور چھتری مادھو سنگھ سولنکی کی قیادت میں متحد ہو گئے اور مسلمان پہلی بار شریک حکومت ہوا تو گجرات میں لمبے مسلم کش فسادات شروع ہوئے تھے جن کی انتہا قریب دو دہائیوں بعد مودی کی حکومت میں ہوئی۔ اس میں سیکولر جماعتوں کے بہت لوگ شریک تھے لہٰذا نظریاتی پارٹیوں کا ہندوستان میں کوئی دور نہیں آیا ہے۔

منتخب نمائندوں کے پارٹی بدلنے، حکومتوں کے عدم استحکام اور "آیا رام گیا رام" سے تنگ آکر پارلیمنٹ نے ایک قانون وضع کیا جس میں نمائندوں کو نمائندگی کے درمیان پارٹی بدلنے یا پارٹی کے خلاف ووٹ دینے کی پابندی عائد کی۔ پہلے تو کسی پارٹی کے ایک تہائی نمائندگان ٹوٹ کر الگ اپنی پارٹی بنا سکتے تھے یا کسی پارٹی میں شامل ہو سکتے تھے لیکن بعد میں یہ بھی ناممکن ہو گیا اور اب کسی بھی پارٹی سے منتخب نمائندے اس پارٹی کی قیادت کے بندھوا مزدور سے زیادہ کچھ نہیں۔ اب تو پارٹی کے منتخب نمائندے پارٹی کی پالیسیوں پر تنقید بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ جب مسلمان کسی پارٹی سے منتخب ہوتا ہے تو وہ صرف اس پارٹی کی قیادت کے مفادات کی نگرانی کر سکتا ہے اور اس سے یہ امید کرنا کہ وہ مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرے گا عبث ہے۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

ایک دوسری دلچسپ بات ہماری ریاست اور دوسری شمالی ریاستوں کی یہ ہے کہ مختلف پارٹیاں سیاسی پارٹیاں نہیں ہیں بلکہ ذات یا ذاتوں کا اتحاد ہیں۔ ذاتوں نے پارٹیوں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے ہر پارٹی کو دیکھیں تو جو منظر ابھرتا ہے وہ یہ ہے۔ ایک بڑا دائرہ کھینچیں تو اس میں کئی ذاتوں کے چھوٹے موٹے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک چھوٹا دوسرا دائرہ ہوتا ہے جس میں اس پارٹی کی ذاتوں کا جن میں پارٹی اتحاد ہے صرف اس کے لوگ نظر آتے ہیں اور اندر سب سے چھوٹا دائرہ ہے جس میں اس ذات کے لوگ ہوتے ہیں جن کا اس پارٹی پر غلبہ ہے اور سب سے اندر ایک coterie ہوتی ہے جہاں اس ذات کے بھی خواص لوگ ہوتے ہیں۔ سیاست ایک خاندانی وراثت میں تبدیل ہو گئی ہے اقربا پروری اور بھائی بھتیجاواد ہر پارٹی میں ہے۔ جمہوریت کے اس سانحہ پر کسی کو احساس زیاں بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت ہر پارٹی میں باہر والے دائرے سے زیادہ نہیں ہے۔ جہاں وہ زیب داستان کے لئے ہیں اور مسلمان "قائد" بھی اپنے اسی رول پر قانع ہیں۔

بدھو میاں بھی سونیا گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

ظاہر ہے کہ پارٹیوں کی پالیسیوں پر ان کے مسلم ممبروں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اس پارٹی کی غالب ذات کی قیادت کی طرف نہایت فدویانہ طرز سے نظر کرم کے لئے حسرت و یاس سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مسلم نمائندہ زیادہ ہاتھ پیر مارتا ہے تو اسے فوراً اس کی جگہ بتا دی جاتی ہے۔

یہ سب پارٹیاں آپس میں دست و گریباں رہتی ہیں لیکن ایک معاملہ میں سب کا اتفاق ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان آزاد سیاسی حیثیت کا مالک نہ ہو اور کوئی شخص مسلمانوں کے قائد کی حیثیت سے نہ

ابھرے، پارٹیاں اپنی حکومتوں کی ہی ایسی تیسی کر دیتی ہیں۔ اگر وہاں مسلم عنصر مضبوط نظر آتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ سب ان حالات سے باخبر ہیں اور مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ موجودہ سیاسی نظام میں نام نہاد سیکولر پارٹیوں کی تمام تر کوشش اس بات کی ہے کہ مسلمان ووٹ تو دے لیکن کسی بھی طرح پالیسیوں پر اثر انداز نہ ہو۔ مسلمان انہیں ووٹ تو دے لیکن پھر کوئی بنیادی مانگ نہ اٹھائے، نہ اقتدار چاہے۔

پچھلے دنوں مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کی بھی تگ ودو کی اس مجبور و مقہور طبقہ کی اخلاقی پستی کے سبب دیکھا گیا کہ ایسی اکثر جماعتیں کسی نہ کسی بڑی سیاسی پارٹی کے ہاتھوں بک گئیں اور چند سکوں کے عوض مسلمان ووٹروں کو فروخت کرنے کا کام کیا۔ علماء نما لوگوں کی بھی معتد بہ تعداد الیکشن کے موقع پر جھولا لے کر نکلتی ہے اور سیاسی پارٹیوں کے لئے مسلمانوں سے ووٹ مانگتی ہے۔ اس کام میں یہ عالم نما لوگ فرقہ، مسالک اور برادریوں کے اختلاف کا استعمال بھی بے دریغ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو مختلف حلقوں میں مختلف پارٹیوں کے لئے ووٹ مانگتے نظر آتے ہیں، آخر بیچارے کیا کریں۔ ع

نمک حلال کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں

صرف مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنائی جائے میرے خیال میں یہ فکر سیاسی ناخواندگی اور اسلام کے بنیادی اصولوں سے ناواقفیت کی غمازی کرتی ہے۔ اقلیت اور فرقہ پرستی دونوں الفاظ ہماری ثقافت میں غیر مانوس ہیں۔ مسلمانوں کے لئے تو فرقہ پرستی اللہ پرستی کے خلاف ہے اور اس کے ڈانڈے شرک سے ملتے ہیں۔ ہم اللہ پرست ہیں فرقہ پرست نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک اقلیت ہونے کا سوال ہے اپنے لمبے تاریخی سفر میں مسلمانوں نے کہیں بھی اقلیت ہونے کا دعویٰ نہیں کیا یہ concept قرآن، حدیث اور اسلاف میں کہیں بھی نہیں ملتا، یہ تو دراصل برطانوی استبداد و استعمار کی اختراع ہے جو پچھلی صدی میں ہمیں مزید ذلیل کرنے کے لئے بنائی گئی۔

مسلمان کسی معاشرے میں ایک فیصد ہو یا ننانوے فیصد ہو، اس کا کام قرآن کریم نے اس کے لئے طے کر رکھا ہے۔ وہ تو منتخب کیا گیا ہے نیکی کی طرف بلانے کے لئے، برائیوں کو ختم کرنے کے لئے، عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے اور اللہ کے جملہ حقوق (صرف انسان ہی نہیں) کو تحفظ دینے کے لئے۔ جب فرقہ اور اقلیت دونوں ہی ہماری سیاست کی بنیاد نہیں ہو سکتیں تو پھر کیا بنیاد ہے؟

دنیا کے انسانوں کو دو طرح سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک vertical division ہے جس میں ایمان والے اور بے ایمان لوگ الگ الگ ہیں۔ دوسرا horizontal division ہے جس میں لوگ قرآن کی زبان میں مستضعفین یا مستکبرین ہیں، مستضعفین وہ ہیں جن کا حق مارا گیا ہو، جن کا ہر قسم

کا استحصال ہوا ہے اور جو آج کل مروجہ سیاسی زبان میں سروہارا ہیں۔ مستکبرین میں وہ ہیں جنھوں نے حق مجھ لیا اور استحصال کیا ہے۔ ابوجہل مستکبرین کا نمائندہ ہے اور حضرت سمیہ شہید مستضعفین کی نمائندہ ہیں۔

ہم بحیثیت مسلم اور مکلف مستضعفین کے ساتھ ہیں اور ہماری سیاسی حرکت کی بنیاد یہی ہے۔ یہ ہمارے ملک کی کل آبادی کی نصف سے زائد ہیں اور ہم خود اس میں دو سو سال سے شامل ہیں۔ قبائلی، پسماندہ طبقات اور بھی غریب لوگ اس میں شامل ہیں۔

مستکبرین میں موجودہ سیاست کے سردار، اور سیاسی میدان کے شہسوار ہیں۔ ان کا کام ان قیادت کو باہم لڑاتے رہنا اور غلط issues میں پھنسائے رکھنا ہے تاکہ ان کی نظر ان مستکبرین کی ریشہ دوانیوں کی طرف نہ جائے۔ ہو دراصل مسئلہ نوکریوں میں ریزرویشن نہیں ہے اور نہ دو دا روں کا نام نہاد اخلاقی کردار ہے بلکہ اصل مسئلہ مستضعفین کی قیادت اور سیاسی اقتدار میں حصہ داری کا ہے۔

قرآن نے مسلمانوں کو مستضعفین کے لئے جدوجہد کرنے کی تاکید کی ہے تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو سکے۔ ہماری سیاست کی بنیاد میں بھی یہی جذبہ ہونا چاہئے۔ ہم دنیا میں لوگوں کو آزاد کرنے کے لئے برپا کئے گئے ہیں۔ عوام کے کندھوں پر جو بھاری جوا مستکبرین نے رکھا ہے اسے ہٹانے آئے ہیں انہیں انسانوں کی غلامی کی تنگنائے سے نکال کر رحمت الٰہی کی وسعت میں لے جانے آئے ہیں اور ہم رحمت للعالمین کے پیرو اور پورے عالم کے لئے رحمت ہیں۔ یہ رحمت بلا لحاظ مذہب، نسل، زبان، رنگ ساری مخلوق کے لئے ہے۔

اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے جوانی کے عالم میں مکہ کے مشرک نوجوانوں کے ساتھ مل کر کمزوروں پر ہونے والے ظلم کو روکنے کے لئے اور غرباء کو انصاف دلانے کے لئے ایک سوسائٹی بنائی تھی تاریخ میں اسے "حلف الفضول" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مدینہ میں اقتدار حاصل ہونے کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اب بھی اگر انہیں ایسی حلف کے لئے بلایا جائے تو بخوشی شامل ہوں گے۔ مستضعفین یعنی حزب اللہ اور مستکبرین یعنی حزب الشیطان کی اس جنگ میں قرآن اور سنت رسولؐ ہمارے رہنما ہیں۔ یہی ہماری سیاست کی بنیاد ہونی چاہئے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی موجودہ قیادت مغربی استعمار کے اختراع کردہ نعروں میں پھنس کر اپنی صحیح صلاحیت اپنی روایات اور اپنی طاقت سے ناواقف ہے۔ ہماری طاقت دنیا میں عدل و انصاف کے لئے ہنستے ہنستے ہر قربانی دینے میں ہے۔ کیا امید کی جائے کہ متواتر ناکامیوں کے بعد یہ قیادت صحیح راستہ ڈھونڈھ لے گی یا پھر نئی قیادت پیدا ہوگی۔

قیادت کے سلسلے میں مسلم عوام کی سوچ بھی بہت مثبت نہیں ہے۔ مسلمانوں کو قیادت کے اصول چننے کے لئے دلتوں سے سبق سیکھنا چاہئے۔ مسلمانوں کو بھی فرقہ، مسالک اور ذات برادری کی سطح پر بانٹنے کی کوشش بھی سیاسی جماعتیں کر رہی ہیں جب کہ کبھی کلمہ گو ایک ذات کی طرح ہیں۔ اکثر دیکھا گیا

ہے کہ مسلمان ان بانٹنے والوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دوسری خرابی مسلمانوں کو دھوم دھڑاکے سے پیار ہے جو کسی بھی ابھرتے ہوئے سیاسی طبقے کے لئے سم قاتل ہے۔ پچھلے اسمبلی الیکشن میں جب میں اپنا پرچہ نامزدگی بھرنے گیا تو میں نے اپنی کار خود چلائی اور میرے بغل میں میری اہلیہ تھیں اور کار کی پچھلی سیٹ پر دو پرستار کُ تھے۔ مجھ سے بہت سے مسلمان دوستوں نے شکایت کی کہ مجھے جلوس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔ ایک لکھنؤ کے محلہ گنج میں میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ ووٹ مانگنے کے سلسلے میں گیا تو ایک مسلمان دوکاندار نے مجھ سے کہا کہ اس طرح چند لوگوں کو ساتھ لے کر گھومنے سے لوگ سمجھیں گے کہ آپ اکیلے ہیں اور اس سے الیکشن کی فضا خراب ہوگی۔ جب ہم لوگ بھی بجائے خاموشی سے اپنا حق استعمال کرنے کے لئے دھوم دھڑاکے پر زور دینے لگیں تو یہ نہایت افسوس کی بات ہے۔ لیکن لوگوں نے دیکھا کہ بغیر دھوم دھڑاکے کئے ہوئے میں نے لکھنؤ جیسے بڑے شہر کے میئر کا الیکشن جیت لیا تھا۔ لکھنؤ میں سب کو معلوم ہے کہ یہ محض اس زمانے کے سیاسی مخلصوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب بھارتیہ جنتا پارٹی کو چند ہزار ووٹوں سے جیتایا گیا تا کہ لکھنؤ میں نئی قیادت نہ ابھر سکے۔

مجھے منتخب کرتے ہوئے کانگریس کے ایک بڑے لیڈر نے ایک بار کہا تھا کہ مسلم عوام صرف اس مسلم امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں جس کے پیچھے کوئی مضبوط ہندو لیڈر کھڑا ہو۔ خدا کرے یہ دعویٰ غلط ہو لیکن گزشتہ تجربات بہت کچھ کہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر سوچنا چاہئے کہ یہ صورت حال صحیح ہے یا نہیں اور اگر صحیح ہے تو ان کا سیاسی مستقبل تاریک ہے اور مسلمان ہمیشہ ذیلی حیثیت میں رہیں گے۔ صورت حال تو یہ ہونی چاہئے کہ غیر مسلم امیدوار اس غیر مسلم امیدوار کو ووٹ دیں جس کے پیچھے مسلم قیادت کھڑی ہو۔

عوام میں مسلم قائدین کے تئیں عدم اعتماد پیدا کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے جس میں کردار کشی بھی شامل ہے اور یہ کام بڑی چابک دستی سے کیا جاتا ہے۔ ایسے سب الزامات انتخاب کے موقع پر لگائے جاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور انتخاب کے بعد بھلا دیئے جاتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے عوام آسانی سے گمراہ کر دیئے جاتے ہیں۔ ہماری قیادت کا یہ بھی فرض ہے کہ عوام کو ان خطروں سے باخبر رکھیں اور قائد اور پیروؤں میں ہمیشہ ربط اور گفتگو ہوتی رہے۔ یہ بد قسمتی ہے کہ ہماری قیادت اکثر دوری بنا کر رہتی ہے جب کہ نئی مواصلاتی سہولتوں کی مدد سے متواتر تعلق قائم رکھا جا سکتا ہے۔ قیادت کو اقبال کا یہ نسخہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

☆☆☆

کیا ہمارے علماء موجودہ سیاسی قیادت کا خلا پُر کر سکتے ہیں؟

مولانا سلطان احمد اصلاحی
(مدرسۃ الفلاح علم وادب، علی گڑھ)

اس سوال کا ہماری طرف سے جواب ہے کہ ہمارے علما موجودہ سیاسی قیادت کا خلا پُر نہیں کر سکتے۔ استثنائی صورتیں اور استثنائی مثالیں اس سے علیحدہ ہیں۔ ظاہر نظر میں یہ بات کچھ اجنبی سی اور تعجب پیدا کرنے والی ہو سکتی ہے۔ لیکن برصغیر ہند کی ماضی کی دو سو سال کی تاریخ پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈال جائے تو اس حقیقت کو سمجھنے اور اس کا ادراک کرنے میں زحمت نہیں ہوگی۔ اس پورے عرصے میں سیاسی قیادت کے حوالے سے طبقہ علما کا بحیثیت مجموعی جو کردار رہا ہے، اسے کسی صورت قابل اطمینان اور قابل تشفی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے انیسویں اور بیسویں بلکہ اٹھارہویں صدی عیسوی کا مطالعہ ضروری ہے۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کا فتویٰ اور اس کے تقاضے:

برصغیر ہند میں طبقہ علماء کے سیاسی کردار کا آغاز دراصل حضرت شاہ صاحبؒ کے اسی فتوے سے ہوتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہم اس فتوے کے مضمرات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں جب کہ دہلی کی مغلیہ سلطنت کے نام نہاد بادشاہ شاہ عالم دوم کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بالکل ہی بے دست و پا کر دیا اور اس کی طرف سے دہلی میں باقاعدہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ ”خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا“ (۱) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس اعلان کے بعد جب کہ حضرت شاہ صاحب کے قول دہلی سے لے کر کلکتہ تک اس ملک پر نصاریٰ کا دور دورہ ہو گیا تو ان کی طرف سے انیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ہندوستان کے ”دار الحرب“ ہونے کا تاریخی فتویٰ جاری کیا گیا۔ اس فتوے میں ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کا مطلب تھا کہ اس سے پہلے یہ دار الاسلام تھا، جس میں ملک کے اندر احکام اسلامی کے اجراء کے ساتھ ملکی انتظام تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، جب کہ نئی صورت

حال میں ملک میں احکام کفر جاری ہو گئے ہیں۔ اور پورے ملک میں ہر طرف نصاریٰ کا دور دورہ ہے، اور پورے ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں اور ان کے کنٹرول میں ہے۔ جیسا کہ زیر نظر فتویٰ میں اس کی پوری تفصیل دی گئی ہے۔ (۲) اس فتوے کا مقصد تھا کہ اب جب کہ یہ ملک جو دارالاسلام تھا، دارالحرب میں تبدیل ہو گیا ہے تو جس کفریہ طاقت نے اس کے اوپر جبر قبضہ کر لیا ہے، اب اس کے خلاف ہر طرح کی شورش اور مزاحمت نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ صحیح معنوں میں یہ فرض و واجب ہے، چنانچہ برصغیر ہند میں اس کے بعد ڈیڑھ سو سال یعنی کہ ملک کی آزادی یا تقسیم ۱۹۴۷ء تک طبقہ علما کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ کے خلاف جو محاذ آرائی کی گئی اور اس کو اکھاڑ پھینکنے کی جو کوشش کی گئی اس کی جڑ میں حضرت شاہ صاحب کا یہی فتویٰ تھا، جس کو آگے بڑھاتے ہوئے طبقہ علما کی طرف سے یہ مقدمہ قائم کیا گیا کہ یہ ملک جو مسلمانوں کا تھا چھن جانے کے بعد تو سب سے پہلے یہ انہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان غیر ملکی عیسائیوں کو اس ملک سے بے دخل کریں، اور اس پر اپنے قبضے کو دوبارہ بحال کریں۔ چنانچہ اس راہ میں انھوں نے دل کھول کر قربانیاں دیں، اور جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے اس سے بہت زیادہ دیں جتنا کہ در حقیقت ان کو دینا چاہیے تھا، مسلمانان ہند کی طرف سے آج بھی ان قربانیوں کا تذکرہ اسی شد و مد سے ہوتا ہے اور اس کے باوجود کہ آئے دن ان کو اس کا الٹا صلہ ملتا ہے، اس کے ذکر سے نہ ان کی زبان اور قلم رکتا ہے، اور نہ ان کی طرف سے اس کے فخریہ اظہار میں کوئی کمی آتی ہے۔

اس فتوی کی نارسائی اور اس کے مضمرات:

بادی النظر میں حضرت شاہ صاحب کا یہ فتویٰ اور اس کے تقاضے بہت خوش کن نظر آتے ہیں، لیکن تحقیق کی نظر ڈالی جائے تو اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ ۱۷۶۴ء کی بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست کھا جانے کے بعد جب بادشاہ شاہ عالم نے ۲۶ لاکھ سالانہ پر بہار اور بنگال کی دیوانی انگریزوں کے سپرد کر دی اور اس طرح سے انگریزوں کے حق میں شمالی ہند کے اقتدار سے دستبردار ہو گیا تو آج نہیں تو کل اس کا نتیجہ تو سامنے آنا ہی تھا کہ دہلی کا بادشاہ نام کا بادشاہ رہ جائے اور ملک پر عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ ہو جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لئے نصف صدی کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی اور اس مدت میں مغلیہ سلطنت کے زوال کو روکنے اور انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانی مزاحمت کو مضبوط کرنے کے سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے خانوادے بلکہ اس سے بھی آگے برصغیر ہند کے پورے طبقہ علما کی طرف سے کون سی منصوبہ بند کوشش کی گئی، بکسر کی شکست کے بعد جس بادشاہ کے الہ آباد میں دس سال انگریزوں کی قید میں رہنے کے بعد دہلی آمد پر اس کی آنکھیں نکال لی گئی ہوں (۳) اس کے بعد بھی اس کو بادشاہ تسلیم

کر لینے سے بڑھ کر سادہ لوحی اور کیا ہو سکتی تھی، جس بادشاہ کی حکومت دہلی کے لال قلعہ سے لے کر پالم تک محدود ہو گئی تھی، جیسا کہ اس وقت کا مشہور محاورہ ہو گیا تھا کہ "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" اس بادشاہ کی موجودگی میں اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مزاحمت کے ساتھ ہندوستان میں رہنا تھا تو یقیناً اس کے لئے الگ منصوبہ بندی کی جانی چاہیے تھی، اور اس کی امکانی ناکامیابی کی صورت میں نیا تجزیہ اور نیا راستہ اختیار کرنا ضروری تھا، آگے کی مزاحمت یا ہندوستان کی جنگ آزادی کے حوالہ سے دوسرا سوال اس سے پیدا ہوتا ہے کہ دہلی کی شاہی حکومت کی وراثت ہندوستانی مسلمانوں کو کس اصول کی بنیاد پر مل رہی تھی، اندلس میں اسپین سے بے دخل ہونے کے بعد مسلمان اس ملک کے دعویدار نہ اس وقت ہوئے نہ اب تو ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد اس کی وراثت کی دعویداری ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے کس اصول کے تحت کی جا رہی تھی، (۴) حقیقت یہ ہے کہ دہلی کی مغلیہ سلطنت کی مرکزیت کا خاتمہ ۱۷۵۷ء میں ہی ہو گیا تھا، جب کہ پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تھی، اور اس سانحۂ عظمیٰ پر دہلی کی مغل سلطنت کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی تھی، مغلیہ سلطنت کے اندر غیرت ہوتی تو اس شکست کے بعد ہی وہ دہلی کے تخت و تاج سے دستبردار ہو جاتی۔ یہی ادھوری کسر ۱۷۶۴ء کی بکسر کی شکست سے پوری ہو گئی، جس کا تکملہ اور تتمہ ۱۷۹۹ء میں والی میسور ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے مقابلہ میں شکست اور ان کی شہادت سے ہوا، جن کی کسی قسم کی مدد اور اعانت کا خیال بھی دہلی کی مغلیہ سلطنت اپنے ذہن و دماغ میں نہ لا سکی، بحث کو بڑھاتے ہوئے اس کی روشنی میں ہم اب ۱۸۵۷ء کے غدر اور اس سے آگے کی سو سالہ جنگ آزادی میں علما کے کردار، دوسرے لفظوں میں ان کی سیاسی رہنمائی پر نظر ڈالنی چاہیے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے مالہ وماعلیہ پر ایک نظر:

ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کے ۱۸۰۳/۰۶ء کے حضرت شاہ عبدالعزیز کے تاریخی فتوے کے نتیجہ میں ہندوستانی علما، اور اس کے عوام کی طرف سے انگریزوں سے مزاحمت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا ۱۸۵۷ء کی میرٹھ چھاؤنی کی شورش سے وہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا، برصغیر ہند کی تاریخ میں اس کو جنگ آزادی کا نام دیا جاتا ہے، جبکہ انگریز اور ایسٹ انڈیا کمپنی اسے غدر (Mutiny) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ فردوسی کے شاہنامے کی طرح خاص طور سے مسلمانوں کی طرف سے ۱۸۵۷ء کی اس جنگ آزادی کا تذکرہ غیر معمولی جوش و جذبے سے کیا جاتا ہے۔ ایسا باور کرایا جاتا ہے کہ ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی شکست کے بعد سے ہی مسلمان علما اور عوام اس کا بدلہ لینے کے لئے سرگرم ہو گئے تھے، اور اس کی منصوبہ بندی میں اپنا دن رات ایک کئے ہوئے تھے، دہلی کی مرکزی مغلیہ سلطنت کے کمزور ہو جانے کے بعد

انگریزوں کو شکست دینے کے لئے خاص طور پر ان کا حیدرآباد اور لکھنؤ کی خودمختار ریاستوں سے سرگرم رابطہ تھا، اس لئے کہ دہلی کی مغلیہ سلطنت کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار ہو جانے کے بعد انگریزوں کا مقابلہ خودمختار ریاستوں کی متحدہ قوت سے ہی کیا جا سکتا تھا۔ دریں حالیکہ صورت یہ تھی کہ حیدرآباد کی ریاست اول دن سے انگریزوں کی وفادار تھی، یہاں تک کہ ۱۷۹۹ء کی لڑائی میں مرہٹوں کے ساتھ اس نے بھی ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اسی طرح اودھ کی ریاست بھی انگریزوں کی وفادار تھی جس کی وجہ یہ بڑی کمزوری تھی کہ اس کے پاس لڑنے کے لئے فوج ہی نہ تھی اس لئے کہ شیعہ نوابین اودھ کی فقہ جعفری میں امام کی غیبت میں جہاد کی گنجائش ہی نہ تھی، (۵) سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں برصغیر ہند کے علماء اور مسلمان عوام انگریزوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کس طرح کر سکتے تھے، جن کی منظم فوج تھی اور جو اپنے وسائل کو مجتمع کر کے دن بدن اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرتے جا رہے تھے۔

یہ پس منظر تھا جس میں ۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی فوجی چھاؤنی کی شورش برپا ہوئی اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انگریزی فوج میں پہلے بندوق کے جو کارتوس بنتے تھے وہ چاقو سے کاٹ کر کھولے جاتے تھے بعد میں ترقی دے کر یہ کارتوس ایسے بننے لگے جن کو دانتوں سے کھول لیا جاتا تھا (۶) میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں صحیح یا غلط یہ افواہ پھیل گئی کہ اب کے جو یہاں کارتوس آئے ہیں جنہیں دانتوں سے کھولنا ہے ان میں سور اور گائے کی چربی بھری ہوئی ہے۔ ہندو گائے کی پوجا کرتے ہیں سو اگر یہ فوجی گائے کی چربی پر بھڑکے تو اس کی وجہ سمجھی جا سکتی ہے، لیکن مسلمان فوجی سور کی چربی پر اس درجہ کیوں بھڑک گئے۔ قرآن میں حرمت صرف سور کے گوشت کی ہے، ولحم الخنزیر (مائدہ: ۳) باقی ضرورت کے تقاضے سے اس کے بال سے دھاگہ بنایا جائے تو اس کے استعمال کی اجازت ہے۔ فقہ میں اس کی صراحت ہے۔ (۷) یہی بات اس کی ہڈی اور چربی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ انگریز جو یہاں بہت تھوڑی تعداد میں رہ کر ملک پر حکومت کر رہے تھے، وہ جان بوجھ کر اپنے لئے مصیبتیں کیوں کھڑی کر سکتے تھے، اس پس منظر میں اگر انھوں نے سور اور گائے کی چربی کے کارتوس بنائے ہوں گے تو یقیناً ضرورت کے تقاضے سے ہی بنائے ہوں گے، خواہ مخواہ کے لئے اپنی جان کو آفت میں ڈالنے کے مقصد سے انھوں نے ایسا نہ کیا ہو گا۔ اس صورت میں گائے کی چربی سے الگ مسلمان فوجیوں کے لئے الضرورات تبیح المحظورات کا قاعدہ فقہیہ موجود تھا۔ اور ضرورت کی حد تک سور کی چربی کی حرمت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کو گوارہ کیا جا سکتا تھا۔ دوسرا مسئلہ اس سے اہم ہے۔ میرٹھ کی چھاؤنی کے ہندو فوجیوں کو چھوڑیے وہ اپنے رویے کی اپنے قاعدے سے توجیہ کریں، اس چھاؤنی کے مسلمان سپاہی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے باقاعدہ تنخواہ یافتہ ملازم تھے، ان کے لئے اپنے ایمپلائر کے خلاف بغاوت کرنے کا کیا جواز تھا، کارتوس کی شکایت تھی تو

[illegible] داروں کے سامنے رکھتا تھا، شنوائی نہ بھی ہوتی تب بھی ان کے لئے اوپر کی تفصیل سے [illegible] کا کیا جواز تھا، لیکن ان سب کو نظر انداز کر کے ان کے لئے انگریز حکومت کا تختہ پلٹنے کا موقع [illegible] آ گیا تھا۔ معلوم ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی تعداد کسی زمانہ میں تین لاکھ سے اوپر نہیں [illegible] (۸) ایسٹ انڈیا کمپنی کی بیشتر فوج ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ان کی تعداد کی یہ قلت اس کا [illegible] کرتی تھی کہ اس ملک میں وہ کوئی بھی اور پھیلی ہوئی لڑائی نہ چھیڑیں، اس لئے وہ اپنے معروف [illegible] "[illegible] اور حکومت کرو" (divide and rule) کے تحت ہندوستانی ریاستوں کو ایک دوسرے سے الجھائے رکھتے تھے، اور اپنے لئے ان میں سے کسی سے مزاحمت کا فیصلہ اسی وقت کرتے تھے جب [illegible] کے سوا دوسرا چارہ کار نہ ہو، اس کے باوجود انگریز کی منظم فوج کا مقابلہ اسی صورت میں کیا جا سکتا [illegible] کہ ہندوستان کی خودمختار ریاستیں آپس میں متحد ہو کر ان پر حملہ آور ہوتیں، اور پورے ملک میں انگریزوں کو مار بھگانے کی مشترکہ مہم شروع ہو جاتی، (۹) اپنے ڈھائی سو سال کے عرصہ حکمرانی میں [illegible] عوام کی طرف سے ان کی مزاحمت کی یہ صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی، اگر ایسا ہوتا تو ۱۸۵۷ء سے [illegible] پہلے ۱۷۹۹ء کی ریاست میسور کی لڑائی ہی میں ہندوستان سے انگریزوں کے پیر اکھڑ گئے ہوتے۔ [illegible] ٹیپو اس لڑائی میں اکیلے تھے، اور مرہٹوں کو چھوڑیے نظام حیدرآباد بھی اس لڑائی میں انگریزوں کے ساتھ تھے، ۱۸۵۷ء کے غدر کا معاملہ اس سے مختلف نہ تھا، یہ شورش ایک خاص وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور اس کا دائرہ حد درجہ محدود اور مخصوص تھا، ہندوستان کی ۵۵۰ یا ۵۷۰ ریاستوں میں سے دس [illegible] ریاستوں کی بھی اس میں شرکت اور شمولیت نہ تھی۔ (۱۰) میرٹھ کی چھاؤنی سے اٹھنے والی اس شورش میں دہلی اور اس کے اطراف کے ہندوستانی عوام شامل ہوئے جن میں غالب ترین اکثریت مسلمانوں کی تھی، انگریز کی منظم فوج کا مقابلہ اس منتشر مزاحمت کے بس کا نہ تھا؛ انجام ظاہر تھا، مزاحمت ناکام ہوئی۔ اس لڑائی میں انگریز فوجی ۱۵۰۰ کی تعداد میں مارے گئے دہلی اور اس کے اطراف میں اس کا جو رد عمل ہوتا تھا وہ سامنے آیا۔ انگریزوں نے دہلی میں لال قلعہ سے لے کر مسجد فتح پوری تک درختوں پر [illegible] باندھ دیں اور مسلمان لگاتار ان پر پھانسیوں پر لٹکائے جاتے رہے، درختوں پر پھانسی کے پھندے لٹکتے رہے، انگریز ہاتھی پر بیٹھا کر مسلمانوں کو لے کر چلتے اور ان کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر آگے بڑھ جاتے، نتیجے میں روایت کے فرق سے صرف دہلی اور اس کے اطراف میں ۲۷ ہزار سے لے کر ۵۷ ہزار تک صرف علماء بدترین صورت میں پھانسی کے پھندوں پر لٹکائے گئے، اس کے ساتھ انگریز کے اس انتقام کا دائرہ پورے شمالی ہند تک پھیلا، اور ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلمان مارے اور پھانسی کے پھندوں پر لٹکائے گئے۔ (۱۱) شمالی ہند میں جگہ جگہ نیم، آم، اور برگد کے پیڑ موجود ہیں جن کو ان

پھانسیوں کے لئے استعمال کیا گیا، ذات میں ہم کو بھی ہم نے ایک ایسے پیڑ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جس پر ۱۸۵۷ء میں ۹۰۵ مسلمان پھانسی پر لٹکائے گئے تھے۔(۱۳) خود بہادر شاہ کے بیٹے انتہائی بے دردی کے ساتھ دہلی کے خونی دروازے پر مارے گئے؛ اور ان کے سروں کو سجا کر طشت میں ان کے سامنے پیش کیا گیا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرٹھ کی چھاؤنی کی یہ وقتی شورش ہندوستان سے انگریزوں کو بے دخل کرنے کی لڑائی میں کس طرح تبدیل ہو سکتی تھی، میرٹھ چھاؤنی کے کم علم اور کم فہم مسلمان سپاہی اگر اس دھوکے میں آ گئے تھے تو شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرکردگی میں ان کے رفقاء مولانا قاسم نانوتوی اور حافظ ضامن شہید ان کی تائید میں کیسے آ گئے، ملازمت تو ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے، میرٹھ کی چھاؤنی کے مسلمان سپاہی اپنی شکایت کے تدارک میں ناکامی کے بعد اگر انگریزی فوج سے لڑنے کا فیصلہ کرتے تو سب سے پہلے ان کو کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دینا چاہیے تھا اس کے بعد ان کو اپنے ایمپلائر کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کی گنجائش نکل سکتی تھی، ہماری محدود نظر کی حد تک ۱۸۵۷ء کے پورے (Episode) میں ایسے کسی استعفے یا طبقہ علماء کی طرف سے اس کی ترغیب اور اس کے مطالبے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس سے بڑا سوال آخری مغل تاجدار سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ دوم کے کردار کا ہے۔ اپنے باپ معین الدین اکبر دوم کی طرح جس کی حکومت اپنے باپ شاہ عالم دوم سے بھی گھٹ کر دلی تا پالم کے بجائے لال قلعہ کے اندر تک محصور ہو گئی تھی بہادر شاہ ظفر کو بھی انگریزوں کی طرف سے ۱۲ لاکھ سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا۔(۱۳) ۱۸۳۷ء میں اپنی تاج پوشی سے لے کر ۱۸۵۷ء اپنے اقتدار کے خاتمہ تک جس نام نہاد مغل بادشاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے وظیفہ ملتا تھا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک وقتی شورش کے نتیجہ میں اس کے لئے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کا جواز کس دلیل سے پیدا ہوتا تھا، اس زمانہ کے لحاظ سے ۱۲ لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی۔ یقیناً اس کے لئے بادشاہ اور کمپنی کے درمیان باقاعدہ معاہدہ ہوا ہوگا، معاہدہ کی پابندی کی قرآن میں غیر معمولی تاکید ہے، اس کو توڑے بغیر بہادر شاہ ظفر کے لئے میرٹھ کی چھاؤنی کی بغاوت کی قیادت کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔

اس منظر نامے میں اگر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی شورش کو غداری یا غدر (Mutiny) کا نام دیا تو یقیناً وہ اس میں حق بجانب تھے، اور اس کے حوالے سے برصغیر ہند کے طبقہ علماء کو آج بھی یقیناً اپنا احتساب کرنا چاہیے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات و واقعات:

اس تجزیے کی روشنی میں برصغیر ہند کی سیاست میں علماء کی رہنمائی کی صلاحیت کے حوالے سے آگے بڑھیں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء یعنی کہ ملک کی آزادی یا اس کی تقسیم کے حالات و واقعات پر نظر ڈالنا ضروری ہے

انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی طرف سے جو ہندوستان کے دارالحرب قرار دیا جانے کا فتویٰ دیا گیا، اس کے اثرات صحیح معنوں میں ۱۸۵۷ء کے بعد اس صدی کے آخر تک ظاہر ہوئے، ۱۸۵۷ء کے بعد جبکہ برصغیر ہند ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آ گیا، ملک پر انگریز حکمرانوں کی گرفت بھی مضبوط ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے بعد مزاحمت کاروں کے خلاف کارروائیوں میں بھی شدت آئی، اور اس کے دائرے میں بھی وسعت آئی، ۱۸۴۹ء میں انگریز مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لڑکے دلیپ سنگھ کو شکست دے کر کشمیر سمیت پورے پنجاب پر قبضہ کر چکے تھے، اسی طرح بدانتظامی کا الزام لگا کر اس کے بعد ۱۸۵۶ء میں اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو کلکتہ کے مٹیا برج میں نظر بند کر کے اس ریاست پر بھی اپنا قبضہ جما چکے تھے، اور اس طرح کشمیر سے راس کماری اور درۂ خیبر سے برما تک برصغیر ہند میں انگریزی راج قائم ہو چکا تھا، دہلی کے مغل بادشاہ تو جیسا کہ گزرا اس سے بہت پہلے سے انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے، دلیپ سنگھ کو بھی ان کی طرف سے پچاس ہزار پونڈ سالانہ کی پنشن مقرر ہوئی، اسی طرح اودھ کے برطرف نواب کو بھی ایک لاکھ ماہانہ یا ۱۲ لاکھ سالانہ کی سرکار انگریزی کی طرف سے پنشن ملتی تھی۔(۱۴) ۱۸۵۷ء کا سانحہ اس کے بعد پیش آتا ہے جس میں آخری مغل تاجدار کو رنگون میں جلاوطن کر دیا جاتا ہے، اس صورت میں پورے برصغیر میں انگریزی اقتدار مستحکم ہو چکا تھا، اور صحیح بات یہ تھی کہ اس کے خلاف کسی کو پر مارنے کی مجال نہ تھی، اس پس منظر میں تاج برطانیہ کی مزاحمت انفرادی یا ٹکڑیوں کی صورت میں ہی ہو سکتی تھی، اور یہ اسی طرح ہوئی بھی، جس کا نتیجہ ظاہر تھا کہ مزاحمت کاروں کے خلاف انگریزی حکومت کا سخت عتاب اترتا تھا، چنانچہ کچھ کو پھانسی لگائی جاتی، کچھ کو بدترین اذیتوں کا شکار بنایا جاتا، اور کچھ کو کالا پانی، اور مالٹا میں پس دیوار زنداں ڈال دیا جاتا تھا، بیسویں صدی کے اوائل میں ۱۸۵۷ء تک یعنی کہ پوری نصف صدی تک انگریزی حکومت کے مزاحمت کاروں کے لئے دور غیر معمولی طور پر سخت رہا، اور وہ ناقابل بیان مصائب سے دوچار کئے گئے، یورپ میں تعذیب کے جتنے طریقے رائج تھے اور جن کا وہ اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں وہاں تجربہ کر چکے تھے، تعذیب کے ان تمام طریقوں کو نئی جدت طرازیوں کے ساتھ یہاں انھوں نے اپنی حکومت کے مزاحمت کاروں کے خلاف آزمایا۔(۱۵) جن کی غالب اکثریت مسلمان علماء اور عوام کی تھی، سلطنت برطانیہ کے باغیوں کے خلاف تشدد اور تعذیب کا یہ سلسلہ اسی طرح درجہ کے فرق سے ملک کی آزادی یا اس کی تقسیم ۱۹۴۷ء تک جاری رہا، اس میں جلیانوالہ باغ، اور قصہ خوانی بازار کے سانحات بھی پیش آئے اور اشفاق اللہ خاں جیسے آزادی کے متوالے پھانسی کے تختوں پر بھی لٹکائے گئے، جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، اور مولانا حسرت موہانی جیسے آزادی کے مجاہدین کی زندگی کے قریب دس دس سال جیل کی دیواروں کے پیچھے بسر ہوئے، اس پورے منظرنامے میں بحیثیت مجموعی علماء کی پوری جماعت انگریزوں

کے خلاف محاذ آرا تھی، اور ان کی زندگی کا ایک ہی ایجنڈا تھا کہ انگریز ہندوستان سے جائے اور یہ ملک یہاں کے باسیوں کے حوالہ ہو۔(۱۶)

صرف ایک آواز تھی جو اس عام بہر سے الگ تھی، اور وہ معمارِ قوم جواد الدولہ عارف جنگ سرسید احمد خانؒ (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کی تھی جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد اسباب بغاوت ہند کے ذریعہ انگریزوں پر پلٹ وار کیا اس کتاب میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ذمہ دار ہندوستانی عوام کے بجائے حکومت برطانیہ کو قرار دیا، جس کا حاصل تھا کہ تاج برطانیہ نے ہندوستانی عوام اور ان کے جائز مطالبات کا اس طرح خیال نہیں رکھا جیسا کہ وہ اپنے مادر ملک میں اپنے عیسائی عوام کا خیال رکھتی ہے، برطانوی حکومت کی حقیقت پسندی اور اس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ یہ کتاب وہاں کی پارلیمنٹ میں زیر بحث آئی اور ایک طرح سے اس کے بطن سے ۱۸۸۵ء میں اناوہ کے کلکٹر ہیوم کے ذریعہ ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی، جس کا منشاء ہندوستانی عوام اور حکومت برطانیہ کے درمیان دوری کو کم کرنا اور ایک کو دوسرے سے قریب لانا تھا، اپنی زندگی کے آخری دنوں میں محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے نام سے برصغیر ہند میں مسلمانوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لئے انھوں نے ایک نئی تنظیم قائم کی جس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں ان کے رفقاء کے ذریعہ مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی، اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی یا اس کی تقسیم تک برصغیر ہند میں مسلمانوں کی سیاسی جد وجہد کی دھری انہی دونوں تنظیموں کے گرد گھومتی ہے۔

اس میں طبقہ علماء کی غالب ترین اکثریت انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ رہی۔ جس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے بڑے علماء کی شمولیت نے ایک طرح سے اس کو دین وایمان کا مسئلہ بنا دیا تھا۔ مولانا آزادؒ نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ کانگریس کی جو زوردار وکالت کی وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ جب کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شدت پسندی کا کا یہ عالم تھا کہ جس مسلمان کا کفن کھدر کا نہ ہو اس کی نماز جنازہ پڑھانے کو وہ تیار نہ ہوتے تھے۔ اسی بیچ ملک میں ترک موالات اور خلافت تحریک کی تحریکیں چلیں جنھوں نے ایک طرح سے تھوک میں طبقہ علماء کو کانگریس کی جھولی میں ڈال دیا۔ تحریک ترک موالات (non-cooperation) کا مقصد ملک میں برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ تھا، جس سے کہ اس کی طاقت کمزور ہو اور اس ملک سے اس کے نکلنے کی راہ ہموار ہو۔ تحریک خلافت ترکی خلافت عثمانیہ کو بچانے کے مقصد سے قائم کی گئی تھی۔ جس کے سب سے بڑے محرک علی برادران مولانا محمد شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر تھے جن کی والدہ محترمہ بی اماں کا یہ شعر اس وقت عوام وخواص کی زبان پر تھا کہ:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

مسلم لیگ کی حمایت میں طبقہ علماء میں بڑا نام صرف ایک حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۹۴۳ء) کا تھا دوسرا نام شارح مسلم صاحب الملہم مولانا شبیر احمد عثمانی کا ہے جو تقسیم کے وقت پاکستان چلے گئے اور اسی کی خاک کا پیوند بنے ۱۹۴۹ء میں بہاول پور میں ان کا انتقال ہوا (۷)

اس عرصہ میں طبقہ علماء کی سیاسی رہنمائی:

حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے اوائل انیسویں صدی میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے فتوی سے لیکر ۱۹۴۷ء تک ڈیڑھ سو سال کے اس پورے عرصے پر اگر آپ تجزیہ اور تحقیق کی نظر ڈالیں گے تو طبقہ علماء کی سیاسی رہنمائی کے حوالہ سے آپ کو سوال ہی سوال نظر آئیں گے ۱۸۰۳ء شاہ عالم ثانی کی سیاسی بے وقری کے بعد حضرت شاہ عبد العزیز نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتوی تو دے دیا (۱۸) جس کا صاف مطلب تھا کہ اب اس کے عملی حکمرانوں کے خلاف یہاں کے مسلمانوں کے لئے مسلح بغاوت جائز ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ حضرت شاہ صاحب کی طرف سے اس کے ذہنی تقاضوں کی ادائیگی کے لئے کوئی منصوبہ بند جد وجہد کی گئی ہو۔ خود مختار ریاستوں سے اس سلسلے میں کوئی رابطہ کیا گیا ہو، اور انگریزی سلطنت کے خلاف مسلح بغاوت کے لئے عوامی رابطہ کی کوئی مہم چلائی گئی ہو۔ اس کے بجائے معروف روایت کے مطابق حضرت شاہ صاحب بدستور اپنے درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول رہے۔ بعد کے علماء کا حال اس سے مختلف نہیں رہا جن کو ایک بار بھی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو متنبہ کرتے جنھوں نے ۱۸۳۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا ۲۰ سال کا عرصہ محفل شعر وشاعری اور قافیہ آرائی میں گزار دیا۔ بے حسی کی حد تھی کہ کمپنی کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود اور اس کے باوجود کہ لال قلعہ کے شہزادے اس کی چہار دیواری سے اہالیان دہلی کے سامنے اپنے کٹورے ہلاتے تھے کہ ہماری پیٹ کی آگ بجھانے کا کچھ سامان کیا جائے، مغلیہ سلطنت کا یہ شہنشاہ دہلی کے شاعروں سے اپنی شان میں قصیدے لکھواتا تھا۔ دیگر شعراء کے علاوہ ان قصیدہ خوانوں میں ایک اسد اللہ خان مرزا غالب بھی تھے جو مدت العمر اپنی اس ناگوار خدمت کے لئے کڑھتے رہے۔ ایک موقع پر بادشاہ کی خدمت میں اپنی طویل عرضداشت میں ان کے یہ اشعار بھی تھے:

پیر و مرشد اگر چہ مجھ کو نہیں — شوق آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے باد زمہریر آزار

لال قلعہ کی چہار دیواری میں شعر وشاعری اور خوش گپیوں کا دور دورہ رہتا تھا۔ اور ایڑی چوٹی کا زور مصرعوں پر گرہ لگانے پر صرف ہوتا تھا۔ اسی طرح کا ایک مصرعہ تھا۔

اس لئے تصویر بھی ہم سے نہ کھنچوائی گئی۔ جس پر بڑی مشکل سے یہ گرہ لگانے میں کامیابی ملی کہ
ایک سے جب دو ہوئے تو شان یکتائی گئی، اب شعر مکمل ہوا۔

ایک سے جب دو ہوئے تو شان یکتائی گئی اس لئے تصویر بھی ہم سے نہ کھنچوائی گئی

بلاشبہ یہ شعر بہت خوب ہے اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری لاجواب ہے۔ لیکن سربراہ مملکت کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے قلم آجائے اور انتظام (administration) کی جگہ تصنیف وتالیف لے لے تو حکومتوں کی طرح اداروں اور تنظیموں کا بھی بیڑا غرق ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔

لال قلعہ کی یہ تصویر تھی لیکن دہلی کا طبقۂ علماء پوری طرح بے فکر تھا اور اپنی معمول کی مصروفیات میں خوش اور مطمئن تھا۔ حالات کے تھپیڑے سے کاش کہ بہادر شاہ کو ہی خودنگری کی توفیق ہوتی ورنہ اس ملک سے انگریز کی بے دخلی ہی میں اگر وہ اس کی نجات سمجھتے تھے تو ۴۰ سال بعد اچانک اس کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کے بجائے اس سے بہت پہلے سے اس کے لئے منصوبہ بندی کرتے۔ آگے کے مرحلے میں جیسا کہ گزرا، بحیثیت مجموعی طبقۂ علماء انگریز کے خلاف شمشیر برہنہ تھا۔ ان میں سے جو صحافی تھے وہ اپنی صحافت سے اور جو خطیب تھے وہ اپنی خطابت سے اپنے اپنے محاذ کو گرمائے ہوئے تھے۔ جو درس وتدریس میں مشغول تھے وہ اپنے حلقہ ہائے درس میں اس کا بگل بجائے ہوئے تھے یہاں تک کہ خانقاہی نظام سے وابستہ ہستیوں کا بھی تنہا یہی ایجنڈہ تھا جس کے لئے وہ اپنے عقیدت مندوں کو میدان میں اتارنے کے لئے بے چین تھے جبکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ۱۸۳۱ء میں سرحد میں اسلامی حکومت کے قیام کی حضرت سید احمد شہید اور اسمٰعیل شہید کی تحریک ناکام ہو چکی تھی جس کی بہر حال ایک وجہ یہ تھی کہ زمینی حقائق کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ اس کے قریب سو سال بعد بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں حضرت شیخ الہند کی ریشمی رومال تحریک اور افغانستان میں جلاوطن حکومت کے قیام کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ اس میں خوش فہمی اور جوش کا عنصر غالب تھا اور تاج برطانیہ کی صحیح طاقت آنکی نہیں جاسکی۔ اپنی تفصیلات کے ساتھ ریشمی رومال تحریک ناکام ہوئی اور شیخ الہند اپنے عزیز شاگرد مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ مالٹا میں قید کر دئے گئے۔ اس کے رد عمل میں مولانا محمود حسن دیوبندی کی انگریز دشمنی اپنی مثال آپ تھی۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی ان کی لگاتار اور بے تکان تنقیدوں کے پس منظر میں عقیدت مندوں کی طرف سے جب ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ حضرت آپ تو انگریزوں پر تنقید کرتے ہی رہتے ہیں تو کیا کوئی چیز ان کی اچھی بھی ہوتی ہے۔ اس پر شیخ الہند کا برجستہ جواب تھا کہ ہاں ان کے کباب اچھے ہوتے ہیں (۱۹) اور حضرت کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ پر فدا تھے۔ ان رسالوں کا ان کو بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ اور مدیر الہلال کی مدح میں وہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ (۲۰) کے اس شعر کے ذریعہ رطب اللسان رہتے تھے البتہ ضرورت کے تحت وہ اس میں ہمیں کو بھی سے بدل کر پڑھتے تھے:

کوئی اس حلقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

کچی عمر میں مولانا آزاد کا دماغ خراب کرنے میں شیخ الہند کی اس مدح سرائی کا دخل ہو تو بیجا اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ تنقید اور تجزیے کے میزان میں الہلال اور البلاغ کی اپنی کمزوریاں تھیں۔ مولانا آزاد اس کے صفحات میں زمین سے زیادہ آسمان سے بولتے تھے اور جو کچھ وہ کہتے تھے زمین پر اس کے روبہ عمل آنے کا دور دور تک امکان نہیں تھا۔ جذباتی قوم کو جذباتی تحریر اور جذباتی تقریر کی ضرورت تھی اور مولانا آزاد قوم کو اس کا بھرپور مواد فراہم کرتے تھے۔ الہلال اور البلاغ کی دوسری بڑی کمزوری آیات قرآنی کا بیجا استعمال تھا، جس کا آج تک طبقۂ علماء کی طرف سے جائزہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی گئی (۲۱) مولانا آزاد اسی زمانہ میں شدت پسند ہندو کانگریسیوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ جس کے زیر اثر انھوں نے تقسیم بنگال کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ حالانکہ یہ تمام تر مسلمانوں کے مفاد میں تھا۔ لارڈ کرزن نے اسی مقصد سے اس صوبہ کو مشرق اور مغرب کے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ لیکن ہندوؤں کی شدید مخالفت کی وجہ سے ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کو اس فیصلے کو واپس لینا پڑا تھا۔ تقسیم بنگال کی مخالفت کی ہندوؤں کی اس تحریک میں مولانا آزاد ان کے ساتھ تھے (۲۲) آگے ۱۹۲۰ء میں رانچی جیل سے رہائی کے بعد مولانا آزاد پوری طرح کانگریس کی گرفت میں تھے جس سے آخر وقت تک ان کو رہائی نصیب نہ ہو سکی بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خلافت تحریک میں بھی ان کی شرکت رہی۔ جس نے سب سے زیادہ مسلمانوں کو نقصان پہونچایا۔ اس کی وجہ سے پہلی بار ہندوستان کی سیکولر سیاست مذہبیت زدہ ہوئی اور اس کے پلیٹ فارم سے مذہبی جذبات کا استحصال کیا گیا۔ اس کی وجہ سے ترکی کی عثمانی خلافت تو نہیں بچ سکی البتہ برصغیر ہند میں اپنے مفادات کا ضرور سودا کرلیا گیا۔ کانگریس کا یہی مقصد تھا خلافت کے نام سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا استحصال کر کے وہ ان کو اپنے فولڈ میں لانا چاہتی تھی۔ اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہی۔ اس خطرے کو صرف محمد علی جناح کی تیز نگاہوں نے بھانپا۔ اور جن کی اس وقت تک کانگریس سے دوری نہیں ہوئی تھی وہ اس پر اس درجہ ناراض ہوئے کہ ملک چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے اور بعد میں بہت منانے پر ہندوستان آئے (۲۳) خلافت پر علی برادران کا غلبہ تھا اور اس وقت اسٹیج پر فقط محمد علی جوہر کا تھا۔ اس کی وجہ سے مولانا آزاد کی ان سے نہیں بنتی تھی۔ چنانچہ خلافت سے ان کی وہ قربت باقی نہیں رہی۔ لیکن اس کی وجہ سے مسلمانان ہند کو جو نقصان پہونچنا تھا وہ پہونچ چکا تھا۔ خلافت سے مولانا آزاد کی وفاداری کا اندازہ اسی

سے کیا جاسکتا ہے کہ کمال اتاترک نے جب خلافت کا خاتمہ کر دیا تو اس کو تحریری مبارکباد دینے والوں میں ایک نام حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی تھا۔ کانگریس سے مولانا آزاد کی جو وفاداری رہی اور اس کے لئے نظری بنیادیں فراہم کرنے میں جو ان کا کردار ہے، طبقہ علماء میں کوئی دوسرا ان کا سہیم نہیں۔ لیکن آزادی کے وقت نہرو اور پٹیل کے ساتھ گاندھی جی کی طرف سے بھی ان کو جس طرح درکنار کیا گیا اس سے اپنے آپ ظاہر ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں انھوں نے سیاست کی جو ڈگر پکڑی اور مسلمانوں کو اس پر چلانے کی کوشش کی وہ حقیقت سے زیادہ ایک سراب تھی۔ (۲۴) اور ملت اسلامیہ ہند آزادی کے ۶۲ سال بعد اس کے زخموں سے جس طرح لہولہان ہے، اس کا اندازہ صرف اس کیا جا سکتا ہے انگریزوں کے دوسو سالہ دور اقتدار میں جب کہ مسلمان ان کی مخالفت اور مزاحمت پر کمر بستہ تھے ہندو مسلمان کل ملا کر زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ مارے گئے۔ جب کہ آزادی کے بعد ملک کی تقسیم کے وقت ہی ۱۰ لاکھ لوگ مارے گئے جس میں ایک اندازہ کے مطابق مسلمان سات لاکھ اور بقیہ ہندو، سکھ، عیسائی کل تین لاکھ تھے (۲۵) اور آزادی کی ۶۲ سالہ مدت میں اکتالیس ہزار سے زائد فرقہ وارانہ فسادات میں ۱۰ لاکھ سے زائد مسلمان مارے جاچکے ہیں۔ اسی طرح پورے انگریزی دور اقتدار میں صرف دو مسجدوں کی شہادت کی شہرت ہے۔ مسجد اکبرآبادی حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی مسجد جو اس وقت کے سبھاش پارک میں تھی۔ یہ مسجد اس لئے زد میں آ گئی تھی کہ عہد شاہ جہانی سے لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان کے علاقے میں لوہاروں کی بستی تھی جنھیں خاص اس مقصد سے آباد کیا گیا تھا کہ حکومت کے لئے اسلحے تیار کریں گے ۱۸۵۷ء میں غدر میں جب ان کی بستی کو اجاڑا گیا تو اس کی لپیٹ میں مسجد اکبرآبادی بھی آ گئی (۲۶) جس کی باقیات کو سر سید احمد خاں بانی مسلم علی گڑھ یونیورسٹی اپنے ساتھ لائے اور اسے یونیورسٹی کی ایس ایس ہال کی مرکزی مسجد میں محفوظ کر دیا خوشی کی بات ہے کہ اس وقت دہلی کے غیر مسلم نمائندوں کی طرف سے اس مسجد کی بحالی اور اس کی تعمیر نو کا مطالبہ ہو رہا ہے (۲۷) شاہ جہاں کی دوسری بیوی اورنگ آبادی بیگم کے نام سے منسوب دوسری مسجد اورنگ آبادی جو لال قلعہ اور پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن کے بیچ میں آ گئی اس کی وجہ سے ضرورتاً اس کو زمین بوس کرنا پڑا تھا ورنہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ ۱۸۵۷ء کے ایک باغی جنرل بخت خاں جن کا تعاقب کرتے ہوئے انگریزی فوج جب سلطانپور کے ایک گاؤں یا ایک قصبے میں پہنچی جہاں ان کے روپوش ہونے کی اس کو اطلاع تھی، تو اس پوری بستی کو اس نے زمین بوس کر دیا، لیکن اکیلی مسجد کو جوں کا توں رہنے دیا۔ جس کا ڈھانچہ آج تک اسی طرح برقرار ہے۔ سلطانپور کے راستے لکھنؤ سے اعظم گڑھ بذریعہ بس آتے ہوئے ہم کو بھی اس مسجد کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے (۲۸) جبکہ آزاد ہندوستان کی صورت ہے کہ ملک کے

آزاد ہوتے ہی ۱۹۴۹ء میں اجودھیا کی مشہور تاریخی بابری مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئی تھیں، جس پر معتبر ترین روایت کے مطابق حضرت مولانا حسین احمد مدنی آنسوؤں سے روتے تھے (۲۹) اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کی منحوس تاریخ میں ہندو شرپسندوں کے ہاتھوں یہ مسجد شہید کی جاچکی ہے اس کے علاوہ ملک کے طول و عرض میں سینکڑوں مساجد جن پر ان کا دعویٰ ہے اور وہ ان کی ہٹ لسٹ میں شامل ہے۔ (۳۰) آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کے جان و مال کو جو نقصان ہوا ہے وہ اپنی جگہ اس سے بڑھ کر ان کا جو مورال ڈاؤن ہوا ہے یہاں تک کہ تہذیب تو الگ ان کے ایمان اور عقیدے کے لالے پڑے ہوئے ہیں اس کے پس منظر میں تاریخ کا بہرحال یہ سوال ہے کہ طبقہ علماء کی رہنمائی اور آزادی کی اس لڑائی میں نفع و نقصان کا کیا میزانیہ رہا۔ انگریزی دور اقتدار میں اگر وہ ان کے مزاحم نہ ہوتے اور ملک پر ان کے اقتدار کی حقیقت کو تسلیم کر کے ان کے ساتھ سمجھداری کا معاملہ کرتے تو ان کا اس وقت حال اچھا ہوتا یا وہ جس میں کہ وہ اس وقت ہیں۔ بلاشبہ تقسیم کے زخم کے باوجود آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو بہت کچھ حاصل ہے اور بہت سے پہلوؤں سے وہ بہت اچھے حال میں ہیں لیکن ملک میں فرقہ پرستی کا ناگ جس طرح ان کے سامنے کھڑا ہے اور اس کو نام نہاد سیکولرسٹوں کے ذریعہ جس طرح مسلسل دودھ پلایا جا رہا ہے اس کے پس منظر میں تاریخ کا یہ بہرحال ایک سوال ہے جس کا وہ جواب چاہتی ہے۔

ملک کی آزادی یا اس کی تقسیم کے بعد کی صورت حال اور اس میں طبقہ علماء کی رہنمائی:

یہ اس مضمون کا آخری عنوان ہے اور اسی پر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد کے ہندوستان میں سیاست کے حوالے سے طبقہ علماء کی نارسائی کا حال آزادی کے پہلے کے زمانہ سے مختلف نہیں ہے، خاص طور سے اس صورت میں جبکہ نوعیت کے کسی قدر فرق سے ان دونوں حصوں میں رہنمائی کا یہ تسلسل برقرار ہے، علماء کی سب سے زیادہ نمائندگی کا حق جمعیۃ العلماء ہند کو ہے، کہ اس کا نام ہی علماء کی جمعیۃ ہے اور اپنے آغاز سے ہی اس کی شناخت میں علم دین کم اور سیاست زیادہ ہے۔ ماضی کی طرح آج کے حال میں بھی اس کی یہ شناخت اسی طرح قائم ہے۔ جمعیۃ علماء اس وقت ایک خانوادے میں سکڑ گئی ہے ماضی میں اس کا یہ معاملہ نہیں تھا، اور طبقہ علماء کی وسیع شمولیت اس کا طرۂ امتیاز تھی، جس میں حنفی مسلک کے علماء ہی نہیں اہل حدیث علماء کی بھی اسی طرح شرکت اور شمولیت تھی۔ (۳۱) آزادی سے پہلے جمعیۃ کانگریس میں شامل کبھی نہیں تھی لیکن وہ اس کی گہری حلیف اور یک جان یہ دو قالب کے مصداق تھی، اور ملک کی آزادی کی لڑائی میں وہ اس کے شانہ بشانہ تھی۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے طبقہ علماء کی سیاسی رہنمائی کی کمیوں اور خامیوں پر گفتگو اوپر آ چکی ہے۔ آزادی سے قبل جمعیۃ سے وابستہ علماء پر

بھی اس کو اسی طرح منطبق کیا جا سکتا ہے، آزادی کے بعد اس نے اپنی سیاسی شناخت کو ختم کر کے اپنے کو خدمت خلق کی N.G.O. میں تبدیل کرلیا، جس سے وابستہ افراد کو آزادی ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی سمیت کسی بھی سیکولر پارٹی سے وابستہ رہ سکتے اور اس کے انتخاب میں اپنی قسمت آزما سکتے ہیں، آج کے حالات میں یہ رہنمائی ناقص ہے جس کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے، موجودہ جمعیۃ علماء ہند کی دوسری ناہمواریاں اس کے علاوہ ہیں جس کی کسی قدر تفصیل اپنے مقام پر کی گئی ہے۔(۳۲) برصغیر ہند میں اجتماعی سطح پر طبقہ علماء کی دوسری بڑی نمائندگی جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے ہوتی ہے، آزادی سے پہلے اس کے بانی مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سیاست میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے یکساں درجے میں ناقد تھے، ان جماعتوں پر ان کی یہ تنقید ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل سے قبل کی ہے، لیکن تشکیل جماعت کے بعد جماعت نے اس کو من وعن تسلیم کیا، سو اس تنقید کو جماعت کی تنقید کے کھاتے میں بھی ڈالا جا سکتا ہے، آزاد ہندوستان میں سیاست میں جماعت اسلامی ہند کی اب تک کی رہنمائی بالکل الٹی ہے، اس لئے کہ اس رہنمائی کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کو کافرانہ نظام حکومت سے بالکل الگ تھلگ رہنا چاہیے اور اس کے ساتھ اس کا کسی طرح کا اشتراک اور تعاون نہیں ہونا چاہیے، اس رہنمائی کی اپنی نارسائیاں ہیں جس کے متعلقات کو اس کے مقام پر دیکھا جا سکتا ہے۔(۳۳) سیاسی رہنمائی کے حوالہ سے تشکیل جماعت سے قبل کا بانی جماعت کا اظہار خیال بے اعتدالی سے خالی نہیں تھا، سیاسی کشمکش کے اپنے مشہور سلسلے میں انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو یکساں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، اور متحدہ قومیت کے ساتھ مسلم قوم پرستی کو بھی بالکل اسی طرح کٹہرے میں کھڑا کیا، کانگریس کی متحدہ قومیت پر ان کی تنقید میں تو حقیقت کا ایک عنصر تھا، جس کے سلسلے میں انھوں نے اس وقت کی مشرقی یورپ کی مسلم اقلیت کا جو حوالہ دیا(۳۴) آج کے بوسنیا ہرزیگوینا اور کوسوو اور چین اور روس کی مسلمان اقلیتوں کے حوالہ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، لیکن مسلم قوم پرستی کے حوالہ سے مسلم لیگ پر مولانا کی تنقید میں سوائے خطابت کے تحقیق کا کوئی عنصر نہیں تھا، اس پوری تنقید میں مولانا مرحوم ایک نکتہ بھی ایسا نہیں پیش کر سکے جسے اسلام اور قرآن کے خلاف کہا جا سکے۔(۳۵) آزادی سے قبل مسلم لیگ کا ایجنڈا صرف اور صرف مسلمانوں کے جائز مفادات کا تحفظ تھا، ملک کی تقسیم کا ایجنڈا اس کے یہاں محض کانگریس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے شامل ہوا۔(۳۶) جناب جسونت سنگھ کی کتاب کے بعد اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مسلم لیگ کی قوم پرستی سے پاکستان کی ہندو اقلیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، ۶۲ سال کی تاریخ سے اس کی صداقت پر آج مہر ثبت ہو چکی ہے، جب کہ جارحانہ ہندو قوم پرستی سے وحشت کر جس سے آزاد ہندوستان کی مسلم اقلیت لہولہان ہے کانگریس کی متحدہ قومیت کے نتیجے

بھی اس کے حق میں بہت زیادہ خوش آئند نہیں رہے۔ مسلمانوں کے علاوہ انصاف پسند ہندو کو بھی آج اس کا اسی طرح اعتراف ہے، سیاست کے حوالہ سے آج بھی جماعت اسلامی ہند میں جو کنفیوزن ہے، مرحوم مولانا ابواللیث ندویؒ کے ایک استثناء سے اس کا ذمہ بہت بڑی حد تک اس کے طبقہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔(۳۷) جماعت اسلامی جب تک مودودی فریم ورک سے آزاد نہیں ہوتی سیاست کی درست رہنمائی کی اس سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کرتے ہوئے اس کو اس فریم ورک سے باہر نکل آنا چاہیے۔(۳۸) ان دونوں جماعتوں سے باہر کا جو طبقہ علماء ہے بشمول ندوۃ العلماء، ہندوستان کے حوالے سے سیاست کی اس کی کوئی مستقل سوچ نہیں ہے، جس پر مناسب ہوم ورک کیا گیا ہو، ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ہوم ورک کیا جائے اور کم از کم برصغیر ہند کی گزشتہ دو سو سالہ سیاسی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے سیاست کے سلسلے میں مسلمانان ہند کے لائحہ عمل کا تعین کیا جائے۔(۳۹)

حاصل مبحث:

اس جائزہ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ معاصر ہندوستان میں سیاسی رہنمائی کے حوالہ سے طبقہ علماء پر آنکھ بند کر کے اعتماد نہیں کیا جا سکتا جب تک اس مقصد سے ان کی مناسب ذہن سازی اور ان کی عملی تربیت کا اہتمام نہ ہو، اور اس راستے کی دشواریوں پر قابو نہ پالیا جائے، ان کا اس میدان میں اترنا مفید مطلب نہیں ہو سکتا، برصغیر ہند میں طبقہ علماء کی اصل ضرورت ہے کہ وہ علم وتحقیق، اصلاح امت اور دعوت کے اپنے اصل کام اور اپنے اصل میدان کے لئے یکسو ہو اور اس کے لئے اس کو درکار سہولتیں فراہم کی جائیں، اسی کا وہ اہل ہے، اور اسی کے لئے اس کے وسائل کفایت کرتے ہیں، جو علماء مدرسی نظام سے وابستہ ہیں ان کو چندہ کی ذمہ داریوں سے فارغ کیا جائے، برصغیر ہند میں اس وقت مدرسی تعلیم کا بڑا المیہ ہے کہ اس کے بطن سے اسلامی علوم کے ماہرین بہت کم پیدا ہو رہے ہیں، آج ہندوستان میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے اختصاصین کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، اسی طرح مدرسی نظام کے نصاب میں بھی فوری توسیع کی ضرورت ہے، جس کے تحت کلام اور تصوف کے علاوہ وہاں تاریخ کے ماہرین پیدا ہو سکیں، تاریخ اسلام کے ساتھ تاریخ ہند اور عالمی تاریخ پر بھی ان کو ایسا ہی عبور ہو۔ ہندوستان میں اسلام کی حفاظت اور اس کے دفاع کے پس منظر میں ہندو فاشزم اور اس سے وابستہ لٹریچر پر بھی وسیع اور گہری نظر ہونی ضروری ہے، تقابل ادیان ہمیشہ سے علمائے اسلام کا امتیاز رہا ہے، آج کے ہندوستان میں اس میں اختصاص کی خاص ضرورت ہے، مدرسی نظام سے باہر علماء کا دوسرا طبقہ دینی تنظیموں اور جماعتوں اور مختلف دینی اداروں اور N.G.OS سے وابستہ ہے۔ اس نظام کی اپنی ضروریات اور اس کے تقاضے ہیں اور اس سے وابستہ علماء اپنے اپنے دائرے میں جو خدمات انجام دیتے ہیں وہ اپنی جگہ قابل قدر ہیں، لیکن

سیاست کے حوالہ سے ان تمام طرح کے علماء کا حال ہے کہ ان کو بالائی طبقہ اپنی داخلی سیاست کو امت کی درکار سیاست کا بدل سمجھتا ہے، اسی طرح عام طور پر اس کا طریقہ مین اسٹریم کی سیاست کے بجائے بیک ڈور کی سیاست میں الجھے رہنے کا ہے۔

NGO کتنا ہی طاقتور ہو اس کے ذریعہ مین اسٹریم کی سیاست نہیں کی جا سکتی، مین اسٹریم کی سیاست کے لئے سیاسی پارٹی کی ضرورت ہے اور معاصر ہندوستان میں امت مسلمہ کے سیاسی مسئلہ کا حل مسلم زیر قیادت سیکولر سیاست کا فروغ اور استحکام ہے، متحدہ قومیت کے جال سے نکل کر مسلمانوں کو اپنے پلیٹ فارم سے سیاست کرنی چاہیے اور مولانا آزاد کی زندگی سے سبق لینا چاہیے جن کو ملک کی آزادی کی نازک گھڑی میں فیصلہ سازی کے عمل سے دور رکھا گیا (۳۰)۔ طبقہ علماء اس پہلو سے اپنے آپ کو یکسو کر لے تو مناسب تیاری کے ساتھ سیاست میں اس کی صلاحیت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ملک میں مسلم زیر قیادت سیکولر سیاست کا پلیٹ فارم موجود ہے، علماء کو اس میں سرگرم ہونا چاہیے ضرورت کے تقاضے سے اس اصول کے تحت دوسری سیاسی پارٹی / پارٹیوں کی بھی تشکیل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بہر حال دہلی کی NGOS اور اپنے پلیٹ فارم کے نیم اصلاحی اور نیم سیاسی جلسوں کے گرداب سے نکلنا ہوگا، جس کو نادانی یا چالاکی سے مسلمانوں کی درکار سیاست کا بدل باور کیا اور کرایا جاتا ہے، سیاست بڑے وسائل چاہتی ہے اور خوش حال اور فارغ علماء ہی اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، امت کی اس کے لئے درکار وسائل کی طرف بھی ایسی ہی توجہ ہونی چاہیے اور سیاست میں زکوۃ کے استعمال پر بھی گفتگو ہونی چاہیے، بیک ڈور کی سیاست میں علماء کی طرف سے مدارس اور تنظیموں کے فنڈ میں خورد برد ہوتا ہے، مین اسٹریم کی ہمہ وقتی سیاست کے لئے الگ سے منصوبہ بندی کی جائے، اس کے لئے درکار وسائل فراہم کئے جائیں اور اس کے راستے کی دشواریوں پر قابو پایا جائے۔ ان کمیوں کو دور کئے بغیر معاصر ہندوستان میں طبقہ علماء سیاسی قیادت کے خلاء کو پر نہیں کر سکتا، اس خیال کی اصلاح بھی ضروری ہے کہ مذہبی قیادت کے ساتھ سیاست کی تنظیمی قیادت بھی ہر حال میں مولوی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ مین اسٹریم کی ہمہ وقتی سیاست میں بسا اوقات مسلمانوں کے مسٹر طبقے کو آگے رکھنا مفید مطلب ہو سکتا ہے سیاست کو کارگر اور دھاردار بنانے کے مقصد سے طبقہ علماء کو اس کے لئے بھی تیار رہنا چاہیے۔

حواشی:

(۱) ملاحظہ کیجئے ہماری کتاب "مسلمان اقلیتوں کا مطلوب کردار" / ۱۹۰، مطبوعہ فکر و آگہی، بکھر مو تکیہ کلاں، اعظم گڑھ طبع دوم ۲۰۰۰ء، نظر ثانی اور اضافہ کردہ ایڈیشن۔

(۲) پنڈت نہرو اور اس کے متعلقات پر گفتگو کے لئے: ہماری کتاب "مسلمان اقلیتوں کا مطلوب کردار" / ۱۹۰-۱۹۱ طبع مذکور۔

(۳) غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا تھا۔ بعد میں مرہٹوں نے غلام قادر کو شکست دی اور اسے قتل کر کے ۱۷۸۸ء میں پھر شاہ عالم کو تخت پر بٹھا دیا جس کے بعد وہ ۱۸۰۶ء تک بادشاہ رہا۔ شیخ محمد اکرام، رود کوثر/ ۶۰۰، مطبوعہ تاج کمپنی دہلی ۱۹۸۷ء۔ نیز ملاحظہ ہو: مختصر تاریخ ہند از مولانا سید ابوظفر ندوی/ ۴۵۸-۴۵۹، دار المصنفین، اعظم گڑھ، بار ہشتم ۱۹۸۹ء، اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ۱۹۷۹ء: ہندوستان کی کہانی/ ۲۹، دار المصنفین اعظم گڑھ طبع سیزدہم ۱۹۸۸ء۔

(۴) مزید یہ کہ مغلیہ سلطنت تو خاندانی تھی اور مغل عام ہندوستانیوں کے یہاں اپنے رشتے کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ تو عام ہندوستانی مسلمان ان سے قائم کی گئی حکومت کا کس طرح حصہ دار ہو سکتا تھا۔ یہی بات آگے بڑھ کر ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کے سلسلے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہ ریاستیں بھی خالص شخصی اور خاندانی تھیں اور ان کے خاتمے کے بعد ان کی وراثت کا دعوی بھی عام مسلمان کسی صورت نہیں کر سکتے تھے۔

(۵) ملاحظہ کیجئے: ڈاکٹر عبدالرب نسیم سبحانی کا تحقیقی مقالہ "لکھنؤ کا شعر و ادب (عہد نوابین اودھ کے معاشرتی و ثقافتی تناظر میں)" ص ۶۸-۶۹ / الفلاح پبلیکیشنز، نئی دہلی۔ بار اول ۱۹۹۹ء۔ اس موقع پر اس بحث کے الفاظ ہیں: انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور سر پر منڈلانے والے غلامی کے سایہ کو دفع کرنے کے لئے اگر اودھ کے باشندوں میں جہاد و مجاہدانہ اسپرٹ ابھرتی تو اودھ کے حکمرانوں اور علماء و مجتہدین کی طرف سے سرد مہری کا اظہار کیا جاتا اس لئے کہ فقہ جعفری میں جہاد کی گنجائش ان عام حالات میں نہیں۔ ص ۶۸۔ اسی سلسلے میں آگے ہے: فقہ جعفری میں شرائط جہاد کی سختیاں اتحاد عمل کی راہ میں سنگ گراں تھیں اور اس نے انفرادی طور پر نہیں اجتماعی پیمانے پر بعد میں کیا۔ سید احمد شہید اور ان حضرات کے ہم وطن ہی تھے ان کی قربانی نے پورے صوبے کو جلا کر رکھ دیا مگر یہیں اسی اصول کہ غیبت امام میں جہاد نہیں کی فقہی پابندی نے شیعہ عناصر کو عملی جدوجہد سے کنارہ کش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بھی اعلانیہ اور اجتماعی اقدام میں بھی یہی رکاوٹ رہی۔ ص ۶۹۔

(۶) سید ابوظفر ندوی: مختصر تاریخ ہند/ ۱۰۰ طبع بالا۔

(۷) بعد کے زمانہ میں جب کہ سور کے بالوں سے تیار کردہ دھاگوں کی طرح ہی مضبوط دھاگے الگ سے تیار کئے جانے لگے تو علماء نے بلا ضرورت سور کے بالوں سے تیار شدہ دھاگوں سے اجتناب کو بہتر قرار دیا۔ اس کے باوجود بھی اس کا جواز برقرار رہتا ہے۔

(۸) جناب سلیم پیرزادہ قومی صدر پیس پارٹی آف انڈیا کے مطابق انگریز ہندوستان میں پچاس ہزار سے زائد کبھی نہیں رہے۔ ملک کی تقسیم اور اس سے متصل تاریخ ہند پر جناب پیرزادہ صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور گہرا ہے۔ ان کے مطابق ان کی بیان کردہ یہ تعداد خود انگریزوں کی تحریر کردہ ہے۔ اس کی روشنی میں ہماری زیر نظر تحقیق کو مزید تقویت ملتی ہے۔

(۹) ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں اپنی ترقی یافتہ فوجی طاقت کے علاوہ انگریزوں کو نظام دکن، راجہ نیپال اور سکھوں کی مدد بھی حاصل تھی، جس کی وجہ سے ان کے لئے اس بغاوت کو فرو کرنا مشکل نہیں رہا۔ ملاحظہ ہو: سید ابوظفر ندوی مختصر تاریخ ہند/۱۹ بحوالہ صدر۔ دوسری جگہ بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی اس لڑائی میں پنجاب کے سکھوں اور دوسری ہندستانی ریاستوں نے شرکت نہیں کی بلکہ اس سے آگے انگریزوں کو پوری پوری مدد دی۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی: ہندستان کی کہانی/۹۰ طبع مذکور۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے لکھنؤ کو بھی سکھوں اور گورکھوں کی طاقتور فوج کی مدد سے فتح کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ۱۸۵۷ء کی شورش کے ایک شہید مولانا احمد اللہ شاہ پر فاروق ارگلی کا معلوماتی اور مضمون مطبوعہ اردو روزنامہ سہارا دہلی ۳ نومبر ۲۰۰۹ء ص ۱۲۔ مولانا احمد اللہ شاہ خود اودھ کی اس لڑائی کے ایک بڑے ہیرو تھے جنہوں نے اس پورے علاقے میں انگریزی فوج کے چھکے چھڑا رکھے تھے۔ لیکن جنہیں بدقسمتی سے بدایں لکھنؤ اور اودھ کی سرحد پر شاہجہاں پور سے ۱۸–۲۰ میل کے فاصلے پر واقع ریاست پوایاں کے راجہ جگناتھ کے بھائی بلدیو کی گولیوں سے چھلنی ہو کر ۵ جون ۱۸۵۷ء کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ اس سازش میں راجہ اور اس کا بھائی دونوں شریک تھے۔ راجہ نے مدد کا دعوہ کرکے شاہ صاحب کو اپنے یہاں بلایا تھا۔ ملاحظہ ہو فاروق ارگلی کا مضمون بحوالہ مطبوعہ ۳۱ نومبر ۲۰۰۹ء سہارا دہلی۔

(۱۰) آزادی کے وقت ہندستان میں آزاد ریاستوں کی تعداد عام طور پر ۵۵۵ بتائی جاتی ہے لیکن میڈیا میں یہ تعداد ۶۵۰ سے لے کر ۷۵۰ تک بھی بیان کی جاتی ہے اور یہ قابل فہم ہے۔ اس لئے کہ ان میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی تھیں اور پاکستان اور بنگلہ دیش سمیت ملک کی تقسیم کے وقت چھوٹی ریاستوں کی شمولیت سے یہ تعداد ۷۵۰ تک پہنچ سکتی ہے۔

(۱۱) ایک ذریعہ کے مطابق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دہلی اور اس کے نواح میں بشمول الہ آباد، بریلی، لکھنؤ وغیرہ میں ۵ لاکھ عوام شہید ہوئے۔ صرف صوبہ اودھ میں تقریباً پچیس ہزار علماء و مشاہیر کو سزائے موت دی گئی جب کہ دہلی اردو اخبار کے بانی مولوی محمد باقر کو بعمر ۷۷ سال توپ سے اڑا دیا گیا۔ دیکھئے: شاہد عمادی: مولانا برکت اللہ بھوپالی تحریک آزادی کا ایک روشن باب، مضمون مطبوعہ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ جولائی ۱۹۶۸ء۔ دوسرے ذریعہ کے مطابق ۱۸۵۷ء کے موقع پر پورے ملک میں صرف چند دنوں کے اندر دو لاکھ مسلمان شہید ہوئے جن میں اکیاون ہزار علماء اور چند اصحاب تھے۔ صرف دہلی میں پانچ سو علماء کو پھانسی دی گئی جب کہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۷ء تک صرف تین سال میں انگریزوں نے ۱۴ ہزار علماء کو پھانسی دی۔ ملاحظہ ہو جناب فاروق ارگلی کا تازہ مضمون مطبوعہ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی تحت عنوان: تیغ شہیدان آزادی ۱۸۵۷ء کی دہلی۔ مورخہ ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء جمعہ ص ۱۹۔

(۱۲) کالا پانی میں بھی نیم کا ایک ایسا ہی مشہور پیڑ تھا جس پر بہت سارے مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں زبانی تاریخ (Oral History) کو محفوظ کرنے کا ویسا اہتمام نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہئے اور اس

کی وجہ سے برصغیر ہند اپنے کو بڑے ذخیرۂ علم سے محروم کیے ہوئے ہے۔ اب بھی ضرورت ہے کہ اس سلسلے کی باقی ماندہ تاریخ کو بچانے کا جتن کیا جائے۔

(۱۳) سید ابوظفر ندوی ۱۸۵۷ء، مختصر تاریخ ہند/۱۸۱–۱۸۷، دارالمصنفین اعظم گڑھ بار ششم ۱۹۸۹ء۔ نیز مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ۱۹۷۹ء، ہندستان کی کہانی/۹۳، دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع سیزدہم ۱۹۸۸ء۔

(۱۴) مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی: ہندستان کی کہانی/۸۵–۵۹، دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع سیزدہم ۱۹۸۸ء نیز مولانا سید ابوظفر ندوی مختصر تاریخ ہند/۱۸۹–۱۹۰ دارالمصنفین اعظم گڑھ بار ششم ۱۹۸۹ء۔

(۱۵) ۱۸۵۷ء کے موقع پر دہلی کے اندر ان جدت طراز یوں میں یہ تھا کہ مسلمان زندہ جلا دئے جاتے۔ ساتھ ہی زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سی کر یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی مل کر زندہ جلانے کے علاوہ ہندستانیوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ اسی طرح پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دے کر اس کے لئے راضی کیا جاتا کہ پھانسی پانے والے دیر تک تختے پر لٹکے رہیں تاکہ ان کے تڑپنے کی دردناک حالت کا لطف اٹھایا جا سکے۔ اس تڑپنے کو انگریز 'ناچ' کا نام دیتے تھے جسے دیکھنے میں انہیں مزہ آتا تھا۔ دیکھئے فاروق ارگلی کا مضمون بعنوان جس کو کہیں اوپر نقل کیا گیا ہے: تیغ شہیدان آزادی ۱۸۵۷ء کی دہلی۔ مطبوعہ سہارا دہلی ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء ص ۱۹۔

(۱۶) اس سلسلے کا ایک ممتاز نام علامہ فضل حق خیر آبادی کا ہے جنہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرگرم شرکت کے جرم میں جزائر انڈمان میں کالا پانی کی سزا ہوئی اور وہاں جیل کی ناقابل برداشت اذیتوں کو سہتے ہوئے انہوں نے ۱۸۶۱ء کو وہیں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ام ورقہ الہندیہ یعنی 'باغی ہندستان' کے مصنف یہی علامہ فضل حق خیرآبادی تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں جنرل بخت خاں کے مشورے سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا جس کی جامع مسجد دہلی میں تین سو سے زائد علماء نے حمایت کی تھی۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے علامہ کے حالات زندگی پر جناب فاروق ارگلی کا بہترین مضمون 'نشان علم و فضل علامہ فضل حق خیرآبادی' مطبوعہ روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء ص ۱۲۔ علامہ فضل حق کی اس قبیل کی روایت میں مولانا احمد شاہ مدراسی کا ذکر تھا۔ انہی کے زیر اثر ۱۸۵۷ء میں وہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ حکومت کے وفادار تھے اور لکھنؤ کے صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ ملاحظہ ہو فاروق ارگلی کا مضمون بحوالہ مولانا احمد اللہ شاہ شہید مطبوعہ سہارا دہلی ۱۳ نومبر ۲۰۰۹ء ص ۱۲۔

(۱۷) شیخ محمد اکرام نے بھی مولانا تھانوی کے حالات میں لکھا ہے کہ "آپ نے علانیہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا" نیز ان کے معتقدین میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد تھانوی کا اضافہ کیا ہے جو ان کی بیان کردہ فکر کے مرید تھے۔ دیکھئے: ان کے حتمی سلسلہ تاریخ کی تیسری کڑی موج کوثر/۲۰۰ تاج کمپنی دہلی ۱۸۵۷ء اسی

موقع پر مولانا حسین احمد مدنی ایران کا تبصرہ ہے کہ ندوہ انگریز دشمنی کے سیلاب میں بہہ کر کانگریس سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ اپنی قوم سے رشتہ توڑ دیا۔

(۱۸) انیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں فرائضی تحریک حاجی شریعت اللہ اور ان کے پیروکار بھی ہندوستان کو دارالحرب مانتے تھے اور اسی کی وجہ سے یہاں نماز جمعہ جائز نہیں سمجھتے تھے موج کوثر/ ۵۹۔ حضرت سید احمد شہید کے مرید خاص مولانا کرامت علی جون پوری کی رائے اس کے برعکس تھی۔ فرائضیوں کے برخلاف وہ ہندوستان کو دارالحرب نہیں مانتے تھے اور یہاں جمعہ اور عیدین کو ضروری مانتے تھے۔ اسی طرح وہ انگریزوں کے خلاف تحریک جہاد سے بھی متفق نہ رہے۔ اس کی حکومت برطانیہ کے وفادار طبقے نے اس وقت بڑی اشاعت کی تھی۔ مولانا کرامت علی جون پوری نے مشرقی بنگال میں اصلاح و ہدایت کے کام میں پچاس سال کا وقت لگایا تھا اور اسی سر زمین میں ۱۸۷۳ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ موج کوثر/ ۶۰۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء) نے بھی ۱۹۰۹ء میں الندوہ میں ایک مضمون کے ذریعہ ہدایت دیا تھا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہبا فرض ہے۔ اسی طرح اسی سال ندوہ کے سالانہ اجلاس میں انھوں نے انگریزوں سے وفاداری کا ایک ریزولیشن بھی پاس کرایا تھا۔ موج کوثر/ ۲۲۳۔ بانی علی گڑھ سرسید خاں ہندوستان کے مسئلہ میں مولانا کرامت علی جون پوری کے اس فتوے سے اتفاق نہیں رکھتے تھے جس میں وہ اسے دارالاسلام قرار دیتے تھے۔ اس کے بجائے وہ اس وقت کے ہندوستان کو ایک پہلو سے دارالاسلام اور ایک پہلو سے دارالحرب مانتے تھے۔ موج کوثر/ ۹۲-۹۳ طبع مذکورہ حتی کہ علماء میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی بھی اہل کتاب ہونے کے ناطے انگریزوں سے مزاحمت کو درست نہیں رکھتے تھے۔

(۱۹) روایت ڈاکٹر فضل الرحمن گنوری صاحب انکشاف۔ ایک تحقیقی جائزہ اور تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطہ نظر سے براہ راست۔ ڈاکٹر گنوری مقیم حال کراچی۔ ۱۹۸۰ء تک علی گڑھ کے قیام میں خاکسار کی ان سے قربت رہی۔ اسلامیات پر انھوں نے لکھا کم لیکن ان کی تیاری بہت اچھی تھی۔ اردو کے ساتھ انگریزی بھی وہ معیاری لکھتے تھے۔ عربی کے علاوہ ان کا فارسی کا مطالعہ بھی وسیع اور گہرا تھا۔ راقم نے ان کی علمی صحبتوں سے اپنی استعداد کی حد تک فائدہ اٹھایا۔ وہ خود کاملیت (self Perfection) پر بہت زور دیتے تھے۔ ہم نے اس کو خراج عقیدت بنایا۔

(۲۰) شیفتہ کی شاعری مترجمہ پروفیسر کبیر احمد جائسی کی ہے۔ شعر کی ان کی روایت قدرے مختلف ہے۔ شیفتہ کے دیوان میں یہ شعر نہیں مل سکا۔

(۲۱) ڈاکٹر عارف الاسلام نے اپنی کتاب "سیماب کون سرسید یا آزاد" میں ہماری معلومات کی حد تک اس نکتہ کو پہلی بار اٹھایا ہے۔ یہ تحقیق کا ایک بہترین موضوع ہے۔ اسلامیات اور دینیات کے مدرسے یونیورسٹی اسکالرس کو اس پر توجہ دینا چاہیے۔ سب سے زیادہ سرسید کی قائم کردہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس کو ایجنڈے پر آنا چاہیے۔ یہاں

کے شعبہ دینیات اور شعبہ اسلامیات کے ساتھ تاریخ اور سیاسیات کے شعبہ کی بھی اس میں اپنی دلچسپی ہونی چاہیے۔

(۲۲) بنگال پہلے آسام سے بہار و اڑیسہ تک پھیلا ہوا تھا۔ رقبہ زیادہ ہونے کے سبب اس کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔ وہ پوری تفصیل کے مطابق جب یہ تقسیم ہوئی تو بنگال دو حصوں کا ہوا۔ البتہ آسام ایک چیف کمشنر کے سپرد ہوا۔ بہار اور اڑیسہ کو ملا کر ایک نیا صوبہ بنایا گیا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی: ہندوستان کی کہانی/ ۲۶۳ محولہ بالا۔ یہ تقسیم مسلمانوں کے مفاد میں تھی اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ہے۔ لارڈ کرزن کے مطابق انتظامی ضرورتوں کے علاوہ اس کا دوسرا مقصد تھا کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا صوبہ پیدا کر دیا جائے جس میں ان کی آبادی سب پر غالب ہو۔ دیکھئے: ڈاکٹر عارف الاسلام کی معرکۃ آرا کتاب "سیماب کون سرسید یا آزاد" کا دوسرا ایڈیشن زیر عنوان: سرسید آزاد اور ہندوستانی مسلمان/ ۱۶۷-۱۷۲ بحث کا سلسلہ آگے ص ۲۸۳ تک دراز ہے۔ طباعت زیر اہتمام: ڈاکٹر قمر رضا علی گڑھ ۲۵۹۳۹۲-۹۰۵۔ کتاب کے ملنے کے دوسرے پتوں کے ساتھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ۔ سن اشاعت ۲۰۰۸ء۔ مشرقی بنگال کا یہی مسلم اکثریتی علاقہ تھا جو تقسیم ملک کے وقت مشرقی پاکستان کے نام سے موسوم ہوا جو اب بنگلہ دیش ہے۔

(۲۳) کاش کہ ہمارے طبقہ علماء کو جناح صاحب مرحوم کو سمجھنے اور ان پر پڑھنے کی توفیق ہو۔ برصغیر ہند میں ملت اسلامیہ کی بڑی آفات میں سے ایک ہے۔ جس کی تاریخ دراز ہے اور یہاں ان کے جمود اور کوتاہ نظری کے بڑے اسباب سے ہے۔

(۲۴) آزادی کے بعد کانگریس میں مولانا کی حالت کا اندازہ صرف اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انڈیا ونس فریڈم جو ان کی زندگی میں ۱۹۵۳-۵۴ء میں تیار ہو چکی تھی۔ اپنی حیات میں وہ اس کو چھپوانے کی ہمت نہ کر سکے۔ اور یہ پوری ۱۹۵۸ء میں ان کی وفات کے ایک سال بعد جنوری ۱۹۵۹ء میں پہلی بار شائع ہو سکی۔ اس کا اضافہ شدہ ایڈیشن پہلی بار ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

(۲۵) شہاب الدین حیدر شیخ دہلی کا مراسلہ تحت عنوان: جناح سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر ہمارے لئے نہیں! معروف اردو روزنامہ سحافت یکم ستمبر ۲۰۰۹ء تحت کالم: خیال آپ کا۔ تقسیم ملک کے وقت مرنے والوں کے سلسلے میں یہ تفصیل اس سے پہلے نہیں نظر سے نہیں گزری۔ صحافت، ہمارا سماج اور راشٹریہ سہارا وغیرہ میں چھپنے والے ان کے دوسرے مراسلات بھی اسی طرح معلومات افزا اور فکر انگیز ہوتے ہیں۔

(۲۶) جناب فاروق ارگلی کے محولہ مضمون میں بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں "سہارنپور" آزادی مجاہدین آزادی کا مرکز بن چکا تھا اور اس موقع پر اس کے اطراف و اکناف کے رہنے والوں نے جنگ آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا تھا۔ چنانچہ جب انگریزوں کا دارالسلطنت پر قبضہ ہوا تو انھوں نے ان مقامات کو جو بغاوت کا مرکز رہے تھے، چن چن کر برباد

کردیا۔ اس کی لپیٹ میں یہ مسجد بھی آگئی۔ ملاحظہ ہو اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء مضمون تحت عنوان: شہر جس کو کبھی وہ مقتل تھا، گنج شہیداں آزادی۔ ۱۸۵۷ء کی دلی ص ۱۹۔

(۲۷) دلی کے مغل محل علاقہ کے ایم ایل اے جناب شعیب اقبال کا مطالبہ۔ ہمارا سماج دہلی ۱۲ مارچ ۲۰۰۹ء تحت عنوان: جامع مسجد حسن کاری منصوبہ پر ۲ ماہ میں عملدرآمد ہونے کا امکان۔ ضرورت ہے کہ مسلمانان ہند کی طرف سے اس معاہدہ کو منصوبہ بند طریقے پر آگے بڑھایا جائے۔

(۲۸) اس بقیہ معلومات ہمارے رفیق سفر محترم پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی عطا کردہ تھی۔ اس وقت راشٹریہ سہارا دہلی کے ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں علامہ فضل حق خیرآبادی: برادر عزیز تازہ ۲ نومبر ۲۰۰۹ء میں بہادر شاہ ظفر پر جناب فاروق ارگلی کے مضامین میں جنرل بخت خاں پر مزید پڑھنے کا موقع ملا۔ لیکن یہ سر موقع دو معلومات محترم ظلی صاحب کے ذریعہ ہی سامنے آگئی۔ مولانا احمد اللہ شاہ شہید پر جناب فاروق ارگلی کے تازہ مضمون سے اس سلسلے میں مزید روشنی پڑتی ہے۔ قصبہ محمدی شاہ جہاں پور میں مولانا احمد اللہ شاہ کی عارضی حکومت پر انگریزوں کے حملے کی تاب نہ لاکر اس کے ارکان میں نانا صاحب پیشوا اور شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ جنرل بخت خاں وزیر جنگ نیپال کی طرف نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یہ کہا واقعہ اس پس منظر میں انگریزوں کے تو آپ سے وابستہ ہوگا۔ مولانا احمد اللہ شاہ پر جناب فاروق ارگلی صاحب کا مضمون بحوالہ مطبوعہ روزنامہ سہارا دہلی ۱۳ نومبر ۲۰۰۹ء ص ۱۲۔

(۲۹) روایت مرحوم پروفیسر عتیق احمد صدیقی جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو کے صدر اور ثقافتی کے ذہن رہے۔ یہ نقل بیان ان کے الفاظ ہیں۔ مرحوم قصبہ دیوبند کے رہنے والے تھے اور مولانا حسین احمد مدنی سے وہ اس کی جس طرح روایت کرتے تھے اس سے لگتا تھا کہ انہوں نے خود انہیں اس حالت میں دیکھا ہو۔ یہ علی گڑھ میں ہمارے لئے کرایہ داری کے قیام نات سے ہے۔ سر سید نگر کی مسجد جس کے وہ امام اور متولی تھے۔ ہماری رہائش بھی اسی علاقے میں تھی اور کی مسجد میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کی سعادت حاصل رہتی تھی۔ افسوس کہ یوپی رابطہ کمیٹی کے ایک سفر میں کار حادثہ میں پروفیسر شریف احمد خاں کے ساتھ جو وہ زخمی ہوئے تو پروفیسر شریف تو اسی موقع پر جاں بحق ہوگئے لیکن مرحوم صدیقی کو جو اندر کا کاری زخم لگا تو کو ان کا انتقال ایک سال بعد ہوا۔ لیکن وہ بھی اسی سفر کے شہید رہے۔ پروفیسر عتیق صدیقی متوفی ۷ ار دسمبر ۲۰۰۳ء بروز جمعہ قبل مغرب۔ روایت بحوالہ براہ راست۔

(۳۰) لبراہن کمیشن کی رپورٹ کے آجانے کے بعد شرپسند ہندو پریشد کے لیڈر اشوک سنگھل کا اپنے تازہ بیان میں کہنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اجودھیا، متھرا اور بنارس کی تین مسجدوں سے دستبردار ہوجائیں ورنہ اس ملک کے ۸۰ فیصد ہندو جن کا یہاں کی تین ہزار مسجدوں پر دعوی ہے وہ اپنے اس دعوے کو لے کر آگے بڑھ جائیں گے۔ انگریزی روزنامہ

ہندو ۲۹ نومبر ۲۰۰۹ء تحت عنوان:

Stop calling Dec.6 The saddest day of your life, Singhal tells Advani. The day ought to be celebrated As 'Day of valour', says VHP Leader.

۶ دسمبر کو اپنی زندگی کا افسوس ناک ترین دن کہنا بند کریں۔ مسٹر سنگھل کی اڈوانی کو نصیحت۔ VHP لیڈر کے مطابق اس دن کو اس کے بجائے 'یوم شجاعت' کے طور پر منانا چاہیے۔

(۳۱) اس سے متعلق مولانا عبدالوہاب خلجی کا مضمون ماہنامہ دعوت دارالسلام عمرآباد میں شائع ہوچکا ہے۔ ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کو یہ کردار بحال ہو اور ایک مخصوص طبقہ کے علماء کے بجائے یہ وسیع معنی میں جملہ علماء کی نمائندگی کا حق ادا کرے۔ یہ الگ ہے کہ جمعیۃ اہلحدیث کے پلیٹ فارم سے ہندوستان میں اس وقت علماء اہلحدیث کی اپنی مستقل شناخت بن چکی ہے۔ لیکن ابھی اس کے موضوعات وہی پرانے ہیں۔ زیر نظر مضمون کی مناسبت سے ضرورت ہے کہ جمعیۃ اہلحدیث کا سیاسی کردار واضح ہو اور سیاست میں اہلحدیث علماء کی زیر بحث نارسائی سے آزاد ہو کر وہ سیاست میں اپنے درست کردار کو بھی اپنے ایجنڈے کا حصہ بنائے۔

(۳۲) اداریہ سہ ماہی علم و ادب علی گڑھ جولائی - ستمبر ۲۰۰۹ء تحت عنوان: سیاست میں مسلمانوں کی حصہ داری۔ جمعیۃ کی بعض دوسری کمزوریوں اور خامیوں کی وضاحت کے لئے اسی رسالہ میں ہمارا دوسرا اداریہ سہ ماہی علم و ادب علی گڑھ شمارہ اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۹ء زیر عنوان: جمعیۃ علماء ہند کا تیسواں اجلاس عام۔

(۳۳) ہماری کتاب 'مسلمان اقلیتوں کا مطلوبہ کردار' بحوالہ بالا۔ نیز ہماری زیر ترتیب کتاب 'مسئلہ حاکمیت الٰہ اور غیر الٰہی نظام حکومت' جس کے اجزا سہ ماہی علم و ادب علی گڑھ میں شائع ہو رہے ہیں۔

(۳۴) 'سیاسی کشمکش' کے علاوہ مولانا مرحوم نے اپنے مشہور رسالہ 'مسئلہ قومیت' اور 'خطبہ مدراس' میں بھی متحدہ قومیت اور مسلم نیشنلزم کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کے نقصانات کی تفصیل بیان کی ہے۔ دونوں مطبوعہ ترتیب مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی بار سوم جون ۱۹۸۷ء اور بار اول ۱۹۹۲ء۔ سیاسی کشمکش اب ہمارے یہاں نہیں چھپتی۔ اس کا صرف تیسرا حصہ چھپتا ہے۔ حالانکہ جماعت اسلامی کے حوالے سے اس کتاب کی تاریخی اہمیت ہے اور اس کو مکمل شائع ہونا چاہئے۔ اس لیے اس وقت یہ حوالہ کے لئے دستیاب نہیں ہے۔ کتاب کی تلاش جاری ہے۔

(۳۵) یہ بات حیرتناک ہے کہ تشکیل جماعت کے ۷۰ سال بعد ہندو پاک کہیں بھی لیگ پر مولانا کی اس تنقید پر جماعت کے حلقہ سے کوئی نقد سامنے نہیں آیا اور وہ اسے آج تک بدستور عقیدت مندانہ دہرانے کو اپنی سعادت سمجھتی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب قلت مطالعہ بھی ہے جس کو اب دور ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اپنے تاریخی خطبہ مدراس میں مولانا نے مسلم لیگ کے حوالے سے مسلم قوم پرستی پر جو تنقید کی ہے اس میں بھی کمزوری برقرار ہے۔ اس میں مسلم لیگ کی مجبوریوں اور کانگریس کی طرف سے اس کے ساتھ کی جانے والی بدعہدیوں اور بے وفائیوں کا کوئی ذکر ہی شامل نہیں ہے۔ خوب سمجھنا چاہئے کہ بحیثیت مسلم قوم پرستی کی بنیاد حضرت موسیٰ کی رکھی ہوئی ہے۔ فرعون کو

توحید کی دعوت کے علاوہ قوم بنی اسرائیل کی فلاح و بہبود، ان کی نجات اور ان کو فرعون کے مظالم سے چھٹکارا دلانا ان کے پیغمبرانہ مشن کا دوسرا اہم ترین ایجنڈا تھا جس پر وہ مدت العمر کام کرتے رہے۔ قوم کے لئے الگ ہوم لینڈ کے مطالبہ کی روایت بھی انہی کی قائم کردہ ہے۔ قرآن و سنت میں اس کی مستقل بنیادیں اس کے علاوہ ہیں۔ مسلمان کے مسلمان کا بھائی ہونے اور اس کے دکھ سکھ میں شریک اور اس کو ہر طرح کے ظلم و ناانصافی سے بچانے سے متعلق قرآن و سنت کی جو تعلیمات ہیں وہ اس کی اساس ہیں، جو کسی خاص ملک اور کسی خاص خطے سے آگے گلوبل سطح پر مسلم قومیت کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ یہ صرف اشارہ ہے۔ مناسب مقام پر اس کی تفصیل کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

(۳۶) مرحوم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی مختصر کتاب 'ہندوستان کی کہانی' میں ص ۲۱۸ پر ۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت ملک کی تقسیم کا تنہا ذمہ دار مسلم لیگ کو قرار دیا گیا ہے اور کانگریس کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ ملک تقسیم نہ ہو۔ بانی پاکستان محمد علی جناح اور تقسیم ملک پر جناب جسونت سنگھ کی محققانہ کتاب آجانے کے بعد اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اب تک کی یکجا کانگریس نوازی سے پیچھا چھڑاتے ہوئے امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں دارالمصنفین کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جائے گی۔

(۳۷) جماعت میں اس طبقہ کی قیادت مرحوم مولانا صدر الدین اصلاحی کے سپرد رہی ہے۔ اسی طبقہ علماء میں ثانوی درس گاہ رام پور کے فضلاء کو بھی شامل سمجھنا چاہئے جو بعد میں یونیورسٹیوں سے وابستہ ہو کر طبقہ پروفیسران کا حصہ بن گئے۔ مودودی لٹریچر کی پیروی اور سیاست میں ناقص رہنمائی کے لحاظ سے جماعت کا یہ دانشور طبقہ بھی اس کے روایتی طبقہ علماء سے بہت کم مختلف ہے اور رہا ہے۔

(۳۸) بنگلور کے اپنے حالیہ اجلاس ارکان مئی ۲۰۰۹ء میں جماعت نے اس سلسلے میں آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے بعد کی صورت حال اور زندگی نو میں ارکان جماعت کے کشاکش سے واضح ہے کہ ہندوستان میں سیاست کے حوالے سے اس طرح کی پیچیدہ کاریوں سے جماعت کا کام چلنے والا نہیں۔ جب تک وہ جرأت کر کے مودودی لٹریچر کے بارے میں یوٹرن نہیں کرتی اور اس سلسلے کی نئی تحقیقات کو کھلے دل سے قبول نہیں کرتی، اس کو اپنی اندرونی سیاسی کشمکش سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس کے چلتے ہندوستان میں سیاست کے مشکل ترین کام میں اس کے لئے کچھ کر پانا آسان دکھائی نہیں دیتا۔

(۳۹) دارالعلوم ندوۃ العلماء کی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ ہندوستان کے بجائے اس کا رخ اس سے زیادہ خلیج کی طرف رہتا ہے۔ جس کے اپنے اسباب ہیں اور اس کی نصف صدی کی تاریخ ہے۔ اس کی تفصیل میں اس وقت جانے کا موقع نہیں ہے۔ دارالعلوم دیوبند مدنی خاندان کو برداشت کر رہا ہے تو ندوۃ العلماء پر حسنی خانوادے کا قبضہ ہے جس کی اپنی مخصوص ترجیحات ہیں۔ مزید برآں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے آئیڈیل ہیں جن کے

حصار سے نکلنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ مرحوم مولانا علی میاں کا کام کافی پھیلا ہوا ہے لیکن در حقیقت وہ شوقیہ مصنف ہیں۔ ان کی اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ اس لئے ہندوستانی مسلمان ان کی کتابوں سے اپنے لیے کوئی راہ عمل تلاش نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے سیاسی رہنمائی کے لحاظ سے ندوہ کا حال دیوبند سے بھی کمزور ہے۔ دیوبند کے پاس ناقص ہی سہی لیکن سیاسی رہنمائی ہے۔ جب کہ ندوہ کے پاس مسلمانان ہند کے لئے مطلق کوئی سیاسی رہنمائی نہیں ہے۔ خوب واضح رہے کہ ہندوستان میں طبقہ علماء کی داخلی سیاست کا مسلمانان ہند کی سیاسی رہنمائی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ندوہ اپنے روایتی خول سے نکلے اور اپنی پھیلی ہوئی شاخوں کے ساتھ سیاست میں اپنے کردار کا تعین کرے۔

(۴۰) اس سانحہ کا سب سے کربناک پہلو ہے کہ نہرو اور پٹیل کے ساتھ اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوگئے اور ان دونوں کے ساتھ مہاتما کو بھی مولانا آزاد کی دل آزاری میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔ مولانا آزاد اس واقعہ کے بعد ایسا ٹوٹے کہ ان کی زبان بند ہوگئی اور جیتے جی انہوں نے ایک لاشۂ بے جان کی طرح وقت گزارا۔ کانگریس میں رہ کر جب مولانا آزاد کا یہ حشر ہوا تو کسی دوسرے عالم دین کی کیا بساط ہے کہ وہ وہاں اپنی غیرت اور عزت کی حفاظت کی ضمانت حاصل کر سکے۔ مولانا آزاد کی 'انڈیا ونس فریڈم' اس کا شاہد عدل ہے جس کے مندرجات پر ہمارے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں کوئی بحث نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ اب اس بحث کا آغاز ہو اور ماضی کے بے لاگ جائزے سے حال کو درست اور مستقبل کو روشن کرنے کا سامان کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ محمد علی جناح اور تقسیم ملک پر جناب جسونت سنگھ کی کتاب سے اس بحث کا آغاز ہوا ہے اور اس کے سلسلے میں پرنٹ میڈیا میں بہت کچھ سامنے آیا ہے لیکن اس آغاز کو اس کے انجام تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ اس سے بڑی سطح کے مباحثات و مذاکرات کے ذریعہ اس موضوع کو آگے بڑھنا چاہئے۔ عصری جامعات اور عصری نظام سے وابستہ دانشوروں اور مفکروں کے ساتھ ملک کے مدارس و مراکز اور طبقہ علماء کو بھی اس موضوع میں ایسی ہی دلچسپی لینی چاہیے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ماضی کے جھمیلے میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ماضی کے صحیح تجزیے سے ہی حال درست ہوتا ہے اور حال کی درستگی پر ہی مستقبل کے روشن ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔

☆☆☆

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی ویب سائٹ
انشاء اللہ کچھ ہی دنوں میں منظر عام پر آئے گی۔
www.atqjamaiatulfalah.org

مسلم معاشرہ میں طبقاتی امتیازات
ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
(ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

آج کا مسلم معاشرہ بدقسمتی سے مختلف طبقاتی امتیازات کا شکار ہے۔ ہندو عصبیات کے زیر اثر اس خطہ میں پرورش پانے والے مسلم فکر میں اشرف وارذل کی نام نہاد تقسیم نے بڑی گہری جڑیں پکڑلی ہیں۔ اسلام کی آفاقی تعلیمات اور عدل ومساوات پر مبنی اس کی محکم اقدار مسلم معاشرہ میں اس قدر غبار آلود ہو چکی ہیں کہ آج نظری طور پر اسلام کے تصور مساوات کی وکالت اور اس کا دفاع کرنے کے باوجود دین دار طبقہ اور دعوت وتبلیغ سے شغف رکھنے والے افراد اور تحریکات بھی اس ہندو طبقاتی نظام کے اثرات بد سے خود کو پوری طرح محفوظ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ اس مختصر بحث میں مسلم معاشرہ کے اس مزمن مرض کی تشخیص کرنے اور اس کے اسباب ووجوہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

واقعیت پسندی کا تقاضا:

مرض کا علاج کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مرض کی موجودگی کو تسلیم کیا جائے اور اس کے بُرے اثرات کا اعتراف کیا جائے۔ مریض کو اگر اپنے صحت مند ہونے کا دعویٰ اور خیال خام ہو تو اس کا علاج دنیا کے بہترین طبیب بھی نہیں کر سکتے۔ آج افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہمارے جید علماء اور اکابرین دعوت اسلامی بھی اس المناک صورت کا ادراک کرنے کے بجائے شتر مرغ کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ عام طور پر ان علماء اور دانش وروں کو اس مرض مزمن کا اعتراف ہے جو نام نہاد طبقہ اشراف سے تعلق نہیں رکھتے یا تعلق رکھنے کے باوجود توفیق خداوندی سے عصبیت جاہلیہ سے پاک ہیں۔

واقعیت پسندی کا تقاضا ہے کہ مسلمان اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ اسلام کے تصور مساوات کی عمومی تعلیم اس ملک میں نہ ہو سکی۔ سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے دور زریں میں بھی اسلامی عدل و مساوات اپنی اصل شکل میں اس ملک میں نافذ نہ ہو سکا۔ نہ درباری علماء وصوفیاء نے اس جانب خاطر

خواہ توجہ کی اور نہ حکمرانوں نے اپنے ایجنڈا میں اس ملک کی مظلوم ومقہور عوام کو برابری کا درجہ دے کر اور انہیں بالا امتیاز رنگ ونسل ایک ہی صف میں کھڑا کر کے اسلام کے پیغام وحدت سے روشناس کرایا۔

دہلی سلطنت کے دور میں اس نسلی امتیاز کے خلاف کوئی موثر آواز ہمیں سنائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر محمد عمر کہتے ہیں:

"سلاطین دہلی کے عہد سے ہندوستان میں ایک نئے مسلم سماج کی تشکیل کے باب کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اس زمانے کے مسلم مفکر نسلی بنیاد پر تقسیم کے حامی تھے اور لوگ کسی بھی صورت میں اس خیال کے مؤید نہیں تھے کہ مساوات کے اسلامی تصور کا نفاذ ہندوستان میں مہاجرین اور دیسی مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر کیا جائے۔"(۱)

مشہور دراوڑ مورخ ڈاکٹر ایشور ٹوپا کو سخت شکایت ہے کہ مسلمان علماء برہمنوں کی طبقاتی تقسیم کا توڑ نہ کر سکے اور ہندو سماج ذات پات کے دلدل میں جس بُری طرح پھنسا ہوا تھا اور منوواوی نظام نے ذات پات کے نام پر اس ملک میں ظلم کا جو نظام مسلط کر رکھا تھا، اس کا کوئی عملی بدل وہ پیش نہ کر سکے۔ وہ کہتے ہیں

''اسلامی اقدار کو شہنشاہی سیاست پر قربان کر دیا گیا۔ علمائے اسلام معاشرتی سیاست کے قوانین کو عام فہم بنانے میں بُری طرح ناکام رہے کیونکہ ان میں ہندوستان اور اس کے مسائل کی فہم نہیں تھی۔ وہ اسلامی آئیڈیل کو عقلی یا فقہ آرائی سے پیش کرتے تھے لیکن وہ اسلام کو حقیقی انسان ساز طاقت کے روپ میں ترقی دینے والے لوگ نہیں تھے۔ وہ تو اسلام کے برہمن تھے جنہوں نے اسلام کی تعبیر پر اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اسلام کی حقیقی تعلیمات کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا۔ وہ اسلام کو ایک تعمیری قوت کے روپ میں پیش کرنے میں ناکام رہے، جو ہندوستانی عوام کو زندہ ومتحرک بھائی چارہ کی لڑی میں پرو دیتی۔ اسلام کے مبلغین کی حیثیت سے وہ انسانیت کے ادنیٰ ترین نمونے تھے''۔(۲)

مسلم معاشرہ برہمنیت کے چنگل سے اپنے کو خود آزاد نہیں کرا سکا ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال (۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء) شکوہ کناں ہیں:

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

ڈاکٹر ایشوری ٹوپا کا یہ تبصرہ کہ عہد وسطیٰ کے علماء "اسلام کے برہمن تھے، جنھوں نے اسلام کی تعبیر پر اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی" بظاہر بڑا سخت اور نازیبا تبصرہ لگتا ہے، مگر آج اکیسویں صدی میں بھی مسلم دانشوران اور بعض مسلمان علماء یہی شکوہ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اسلام کی تعبیر وتشریح اور قرآن وسنت کی ترجمانی میں کہیں کوئی جھول ہے جس کی وجہ سے اسلامی تعلیمات بالعموم اور اسلامی برابری بالخصوص موجودہ معاشرہ میں رائج اور نافذ نہیں ہے۔ (۴)

مسلم معاشرہ میں سرایت کردہ اس نسلی امتیاز اور طبقاتی تقسیم کے بنیادی اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کا منصفانہ تجزیہ کیا جاسکے اور اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑنے کی موثر کارروائی عمل میں لائی جاسکے۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد، اس کے اثرات ونتائج اور برکات اور ہندوستانی معاشرہ کی ضمیات، افکار اور روایات سے ان کی آویزش کی تاریخ کا مسلسل مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عبرت ناک صورت حال کے ذمہ دار تین بڑے عوامل ہیں: تاریخی، مذہبی اور سیاسی۔

تاریخی عوامل

ہندوستان میں مسلمانوں کا دور حکومت عام طور پر عہد وسطیٰ کے ہندوستان (Medieval India) کے نام سے معروف ہے۔ یہ پورا دور عہد سلطنت (۱۲۰۶ـ۱۵۲۶ء) اور عہد مغلیہ (۱۵۲۶ـ۱۸۵۷ء) کے دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔ عہد وسطیٰ کا ہندوستان مختلف سیاسی وسماجی، علمی و تمدنی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ اس طویل دور کی تاریخ میں سیاسی واقعات، فوجی توسیعات، تخت وتاج کے حصول کے لئے امراء اور درباریوں کی کش مکش اور شاہانہ عیش وعشرت کی داستانیں بھی ہیں اور دین و مذہب، علم وادب، تمدن وثقافت، صنعت وحرفت، سیاست وحکومت اور سماج ومعاشرت کے مختلف ابواب میں وسیع اور روشن خدمات بھی۔ مگر اس حقیقت سے صرف نظر کرنا بھی مشکل ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم حکومت بادشاہت کے موروثی نظام پر مشتمل تھی اور دربار کے ماحول اور سلاطین کی زندگی پر ایران کی قدیم روایات کی چھاپ تھی اور اس کی کارکردگی میں تیموری اصول جہاں بانی کے اثرات بھی پائے جاتے تھے۔ انھوں نے حکومت کے اصول وضوابط، انتظامیہ کے ترکیبی عناصر اور نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں کسی حد تک اسلام کے اصول واقدار کی ترجمانی بھی کی اور زکوٰۃ، خراج، قضاء، افتاء، احتساب واستحقاق کے مختلف شعبوں میں متعدد ایسے انتظامی شعبہ جات قائم کئے جو واضح طور پر ایشیا وافریقہ کے علاقوں میں پہلے کسی مسلم حکومتوں کے نمونہ پر تھے۔ اسی طرح نظم ونسق کے دائرہ میں بالخصوص محاصل وقضا کے محکمہ میں بہت سی ایسی اصلاحات رائج کیں جو بنیادی طور پر اسلامی حکومت کا جزو تھیں۔ (۵) مگر یہ حقیقت اپنی تعلیمات وروایات کی آئینہ دار نہیں تھی اور نہ ان کی حکومت کے تحت

تمام شعبوں میں شرعی قوانین جاری وساری تھے۔

مورخین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی مساوات کا سورج عرب تاجروں کی آمد سے طلوع ہوا اور جب تک عرب مسلمان اس ملک پر حکومت کرتے رہے اسلامی برابری اور انصاف کا پیغام عام کرتے رہے۔ اپنے قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ انھوں نے اس ملک کے اچھوتوں کو گلے لگایا اور آدم کی اولاد ہونے کے ناطے ان کے ساتھ اسلامی مساوات کا رویہ اپنایا۔ اس کے نتیجہ میں شودروں کا طبقہ خاص طور سے بہت متاثر ہوا اور دائرہ اسلام میں تیزی سے داخل ہوا۔ جنوبی ہندوستان میں عرب تاجروں کے ذریعہ اشاعت اسلام کی جو کوششیں ہوئیں، ان پر مولانا سید سلیمان ندوی نے تحقیقی کام کیا۔ ان اطراف میں اسلامی دعوت کی توسیع کس طرح ہوئی، اس پر وہ فرماتے ہیں کہ حسب ذیل طریقے اختیار کیے گئے:

۱۔ عرب تاجروں نے خود آکر اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ یہاں کی نومسلم عورتوں سے انھوں نے شادیاں کیں۔
۲۔ نیچ ذات کے ہندو اور برہمن، جو برہمنوں کے دباؤ، ظلم اور ترفع اور غرور سے نالاں تھے، انھوں نے اسلام میں آکر غیر عزت پائی۔
۳۔ تاجروں کی فیاضی اور انسانیت نوازی نے غریبوں اور محتاجوں کو اپنے دامن میں پناہ دی۔
۴۔ جو لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر اپنی ذات سے خارج کر دیے جاتے تھے، وہ اسلام کی برادری میں داخل ہوتے گئے۔
۵۔ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو غربت کے مارے عربوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے تھے، وہ ان کو لے کر اسلام کی تربیت دے کر اپنی اولاد کی طرح پال پوس کر جوان کرتے تھے۔
۶۔ اسلام کی روحانی طاقت کی عجیب وغریب نشانیاں ان کی نگاہوں سے گزریں جس نے ان کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔
۷۔ علماء اور درویشوں نے اپنی روحانی کشش کے جلوے بھی دکھائے۔ (۶)

مورخین یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عرب تاجروں کا یہ مساویانہ سلوک اور اسلامی اخوت کی بنیاد پر ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا تعامل زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہ سکا۔ سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کا رویہ بالعموم اس باب میں اسلامی مساوات کی نفی کرتا رہا۔ انھوں نے اپنے سیاسی ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر برہمنیت کے طبقاتی نظام سے صرف نظر کیا اور دھیرے دھیرے ان کی ذاتی زندگی اور معاشرتی

طور طریقوں پر مجوسیت کا غلبہ ہوتا گیا۔ انہوں نے برہمنی نسلی امتیاز کا استحصال کرنے کی بجائے پسماندہ طبقوں اور برادریوں کے ساتھ ناز یبا سلوک کیا۔ سید، شیخ، مغل، پٹھان شریف اقوام میں شمار ہوئے اور غربت کے شکار صنعت وحرفت اور تجارت میں مشغول مسلمان اراذل کہلائے۔ چھوٹی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے نومسلم بھی اسی استحصال کا شکار ہوئے۔

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف سید ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) کے دور حکومت میں نچلے طبقہ کے کسی مسلمان کا خواجگی، مشرفی یا دبیری کے عہدوں پر تقرر نہیں ہو سکتا تھا اور اگر غلطی سے کسی کی تقرری عمل میں آ گئی تو تحقیق ہو جانے کے بعد اسے فوراً برطرف کر دیا جاتا تھا۔

فاضل مورخ نے اس سیاق میں بڑا عبرت ناک واقعہ درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان کے زمانہ میں نظام الملک جنیدی نے امروہہ کی خواجگی کے لئے جمال مرزوق عہدہ دار دار الضرب کو تخت کے سامنے پیش کیا۔ عین پابوسی کی حالت میں خواجہ عزیز بن بہروز وزیر نے یہ شعر پڑھا۔

بدست دوں مدہ خامہ کہ گردوں راجگال افتد
سیہ سنگے کہ در کعبہ است، سازد سنگ استنجا

(کمینے کے ہاتھ میں قلم دان مت دو، اگر اسے موقع میسر آ جائے تو خانہ کعبہ کے حجر اسود کو استنجا کا ڈھیلا بنا دے گا)

وزیر نے یہ شعر پڑھ کر جمال الدین مرزوق کی طرف اشارہ کیا۔ سلطان التمش سمجھ گیا کہ اشارہ کس کی جانب ہے۔ اس نے نظام الملک جنیدی کو طلب کر کے جمال مرزوق کی اصل کے بارے میں تفتیش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ نیچی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

"وزیر نے اس کی صفائی میں کہا کہ اس کا خط عمدہ ہے اور وہ تحریر میں نہایت ہوشیار ہے۔ سلطان شمس الدین التمش وزیر سے رنجیدہ ہوا کہ کم اصلوں کی طرف داری کی وجہ سے میری حکومت میں ان کو تقرر کر کے اس کو رسوا کرتے ہو۔ اس روز شمس الدین التمش بہت ہی ناراض رہا اور اس نے کوئی کام نہ کیا اور حکم دیا کہ دفاتر کے عہدے داروں میں سے خواجہ، متصرف، مشرف اور دبیر کے عہدوں تک جو لوگ ملازم ہیں، ان معتبروں میں معلوم کریں کہ ان میں کتنے کم اصل اور بخیل (لئیم زادہ) برسر کار ہیں۔ تلاش و جستجو کے بعد تینتیس ایسے آدمی نکالے گئے اور ان کے نام بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اسی وقت وہ سب معزول کر دیے گئے۔ اسی تفتیش ہوتی یہی تھی کہ ملک اعز الدین سالار اور ملک قطب الدین حسن غوری نے، جن میں ایک بارک اور دوسرا نکیل دار تھا، تخت شمسی کے سامنے عرض کیا کہ فرمان

کے بموجب متصرفوں اور مشرفوں کی کم اصلی کے سلسلہ میں تفتیش کی گئی اور وہ معزول کر دیے گئے، لیکن اب خداوند عالم کو وزیر کی اصلیت کی بھی تفتیش کرانا چاہئے کہ اس میں کم اصلی کی کوئی رگ نہ ہوتی تو کبھی کم اصلوں کو ملازمت نہ دیتا اور کوئی عہدہ اور ذمہ داری سپرد نہ کرتا۔ اس لئے کہ اصالت بزرگ اور بزرگ زادگی کی پہچان یہ ہے کہ ایک اچھے خاندان کا شخص کسی کم اصل کو معمولی خدمت گاروں میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ایسی حالت میں کسی عہدہ یا منصب پر اس کا تقرر اور حکومت میں اس کی موجودگی کا کیوں کر روادار ہوگا؟ چنانچہ جب وزیر کے نسب کی اچھی طرح تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ نظام الملک کا داد جولاہا تھا"۔(۷)

مسلم ہندوستان میں اس سماجی امتیاز اور طبقاتی تقسیم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کنور محمد اشرف لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں بہر حال، ذات پات کا رواج پوری طرح پھیل چکا ہے، اس کا اثر مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکا ہے اور اس کا ارتقا بھی ہندو ذاتوں کے خطوط پر ہوا ہے۔ دونوں قوموں میں غیر ملک سے آکر بسنے والے بلند ترین سماجی رتبے کے دعویدار ہیں۔ دونوں اقوام کے بزرگ مغربی اقوام سے آئے ہیں۔ جو مرتبہ ہندوؤں کی آرین نسل کو حاصل ہے، وہی مرتبہ مسلم عوام میں عربی، ایرانی، افغانی اور مغل نسل کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور جس طرح اعلیٰ ذاتوں کے ہندو ادنیٰ ذات کی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف شادی نہیں ہو سکتی، اسی طرح مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں ایک سید شیخ کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے لیکن اپنی لڑکی کی شادی کسی شیخ سے نہیں کرے گا۔ اعلیٰ طبقے کے غیر ملکی مسلمانوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے مابین شادی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ البتہ یہ بات صرف ان علاقوں میں ممکن ہے، جہاں دولت مند طبقہ کو اپنی تعداد کم ہونے کی وجہ سے شادی کا مسئلہ بہتر سے بہتر طریقے پر حل کرنا پڑتا ہے۔ ادنیٰ طبقہ کی پیشہ ور اقوام مستقل ذاتوں کی حیثیت سے منظم ہیں، ان کی اپنی پنچایتیں اور عہدے دار ہیں، جو حقہ پانی بند کرنے کے قدیم رواج کے ذریعہ ذاتوں کے قواعد کی پابندی کراتے ہیں"۔(۸)

ناقص مذہبی تشریحات:

مسلم سماج میں نسبی امتیاز اور طبقاتی تقسیم کی ایک وجہ وہ ناقص مذہبی تعبیرات ہیں، جو بعض علمائے اسلام نے تاریخ کے مختلف ادوار میں فراہم کی ہیں۔ انہوں نے قرآن وسنت کی راست تعلیمات اور عدل ومساوات پر مبنی اقدار کی جو تفسیر وتشریح کی اس سے برہمنی طبقاتی امتیازات کو فروغ ملا۔ مسئلہ کے طور پر بعض احادیث میں شادی بیاہ کے سلسلہ میں کفاءت کی قید لگائی گئی ہے۔ یعنی میل کی شادی ہو اور میاں بیوی کے درمیان توافق اور ہم آہنگی ہو تا کہ اس مقدس رشتہ کو مستقبل میں امکانی حد تک ٹوٹنے سے

محفوظ رکھا جاسکے۔ فقہاء نے اس سلسلہ میں عام طور پر چار چیزوں کا اعتبار کیا ہے اور وہ ہیں: دینداری، آزادی، حسب نسب اور پیشہ۔ اور بعض لوگوں نے اس کے ساتھ عیب سے پاک ہونے اور مالدار ہونے کو بھی معتبر گردانا ہے۔ اس طرح یہ کل چھ چیزیں ہوتی ہیں۔(۹) مگر اسلام میں فضیلت کا اصل معیار دینداری اور تقویٰ ہے اور زندگی کے دوسرے تمام دائروں کی طرح شادی بیاہ کے سلسلہ میں بھی قرآن کریم نے اصلاً اسی کو معتبر گردانا ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی صراحت کرتے ہیں کہ کفاءت کے ظاہری اعتبارات کا عام حالات میں لحاظ ہوگا، لیکن جب بھی دو افراد اسلام کے آستانے پر اپنی انا کو پاش پاش کرکے دینی جذبہ سے سرشار ہو کر رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں تو اسلام کے مذکورہ بالا مسلمہ اصول اور صدر اول کے معیاری عمل کی روشنی میں بظاہر بے میل ہونے کے باوجود اسلام کی نظر میں رشتہ بالکل درست ہوگا اور اس کے اس محکم اصول اور خیر القرون کی عملی شہادت کے روبرو فقہ کا کوئی جزئیہ قابل اعتنا قرار نہ پائے گا"۔

مولانا اصلاحی اپنی مذکورہ بالا عبارت پر ایک حاشیہ کا اضافہ بھی کرتے ہیں:

"واضح رہے کہ کفاءت کے سلسلہ کی تقریباً تمام حدیثیں سند کے لحاظ سے کمزور ہیں (الدراية في تخريج أحاديث الهداية على هامش الهداية ۲/۲۹۹-۳۰۰) بلکہ حافظ ابن حجر کا کہنا تو یہ ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہے۔ (فتح الباری ۹/۱۰۶) لیکن چونکہ اس مضمون کی متعدد حدیثیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور صحابہ کرام سے بھی اس طرح کی چیزیں روایت کی گئی ہیں، اس بنا پر عام طور پر فقہاء نے اس کا اعتبار کیا ہے۔ اس سے خود بخود ظاہر ہے کہ جب دونوں کے درمیان ترجیح کا سوال پیدا ہوگا تو وہ اسلام کی اخلاقی فضیلت کی اس اصل محکم کو ہی حاصل ہوگی واللہ اعلم بالصواب"۔(۱۰)

تقریباً اسی طرح کی رائے مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے بھی ظاہر کی ہے۔ ان کی تعبیر کے مطابق کفاءت ... کا نام ہے۔ مرد عورت کے لئے لباس ہے اور عورت مرد کے لئے لباس ہے اور اس لباس کے انتخاب میں مماثلت ہونی چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ میاں بیوی کے ماحول میں ان کے مزاج میں زیادہ دوری ہو اور پھر نباہ نہ ہو سکے۔ یہ کفاءت لڑکی اور اس کے اولیاء کا حق ہے۔ دونوں کی مصلحت اور فائدہ کے لئے شریعت نے اس کا اعتبار کیا ہے۔

"لڑکی اور اس کے ولی اگر غیر کفو میں نکاح کرنے پر آمادہ ہوں تو کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر صورت حال یہ ہوتی ہے کہ غیر کفو میں شادی ہونے پر پورا خاندان کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہماری ناک کٹ جائے گی تو یہ جہالت ہے اور اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔(۱۱)

مگر یہ بھی ایک المناک اور عبرت انگیز صورت حال ہے کہ اسلام کے تصور مساوات کو تسلیم کرنے اور اس پر عقیدہ رکھنے کے باوجود تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں بعض علمائے کرام نے کفاءت کی آڑ میں تفاخر بالانساب کو جائز ٹھہرایا اور موضوع اور کمزور روایات کا سہارا لے کر تفاضل انساب کے لئے گنجائش نکالی اور مختلف حیلوں بہانوں سے چھوٹی برادریوں اور پیشہ ور اقوام کی تذلیل کی۔ یہاں بطور نمونہ مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی مفتی اعظم پاکستان (م ۱۹۷۶ء) کی تصنیف نهايات الأرب في غايات النسب سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ حضرت مفتی نے دارالعلوم دیوبند میں افتا کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں یہ کتاب تحریر کی تھی۔ یہ اقتباسات کسی تبصرہ کے محتاج نہیں ہیں بطور عبرت انہیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

"انساب و قبائل میں انسان کی تقسیم و تفریق خداوند عالم کی عظیم الشان نعمت ہے۔ ایک تیسرا طبقہ وہ ہے جو سرے سے تفاضل انساب ہی کو مٹانا چاہتا ہے اور دینی و شرعی امور سے گزر کر معاملات دنیویہ میں بھی یہی چاہتا ہے کہ کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور اس کا نام مساوات اسلام رکھا ہے اور یہ بات بھی چونکہ نصوص شرعیہ اور احادیث صریحہ کے خلاف ہے اور حدود شرعیہ سے تجاوز ہے اس لئے یہ بھی ایک مستقل مرض قابل اصلاح بن گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی خدمت جب سے اس ناکارہ و آوارہ کے سپرد ہوئی تو آخرالذکر معاملات مساوات کے متعلق اطراف ملک سے سوالات کثرت سے ہوئے۔ نکاح کے معاملات میں کفاءت کے باب کو ان حضرات نے بالکل چھوڑ دیا اور مساوات اسلام کے سچے اور صحیح عنوان کا مضمون یہ غلط صورت بنادی۔ اس لئے خیال ہوا کہ اس بحث کو ایک مستقل رسالہ کی صورت میں لکھ دیا جائے"۔(۱۲)

"بعض مغرب کے دلدادوں کی روشنی میں (جس کو اندھیری کہنا زیادہ موزوں ہے) پرورش پانے والوں نے اس خاص امتیازی اسلامی اور مساوات محمودہ کو بھی ایک غلط معنی پہنانے اور مغربی دہریت آزادی و بے قیدی کا اسلامی مساوات نام رکھ دیا۔ معاملات، نحو نکاح وغیرہ میں بھی انساب اور اکفاء کی رعایت کو جو ٹھیک شرعی قانون ہے (معاذ اللہ) لغو و بے کار بلکہ مضر بتلایا۔ الغرض اسلامی مساوات کو اندھیری نگری کی کہانی بنا دیا اور موجودہ بالشویزم اصول سے جا ملایا"۔(۱۳)

مفتی صاحب مختلف پیشوں اور صنعت و حرفت سے وابستہ مسلمانوں کو غیر اشرف قرار دینے اور ان کی معتبریت کو مشکوک بنانے کے لئے مختلف روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ چند روایات یہ ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کو حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے دیلمی (مجموعہ حدیث)

نے بالفاظ ذیل نقل کیا ہے:

اکذب الناس الصباغ (کنز العمال، کتاب البیوع ج ۲ ص ۲۰۱)

(سب لوگوں سے زیادہ جھوٹے رنگ ریز (نیل گر) ہیں)

ارشاد: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا کان یوم القیامۃ نادی مناد أینما خونۃ اللہ فی الأرض؟ فیوتی بالنحاسین والصیارفۃ والحاکۃ (کنز العمال بروایت دیلمی عن ابن عمر، ج ۲ ص ۲۰۱)

(جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی آواز دے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں، جنہوں نے زمین میں رہتے ہوئے اللہ کے ساتھ خیانت کی تھی؟ اس پر ٹھٹھیرے (پیتل، تانبے وغیرہ کے برتن بنانے یا بیچنے والا) ورصراف اور جولاہے حاضر کیے جائیں گے۔)

ارشاد: محدث فریابی حضرت انسؓ کی روایت سے حسب ذیل نقل کرتے ہیں:

شرار امتی الصائغون الصائغون (کنز العمال ج ۲ ص ۲۰۱)

(میری امت میں سب سے زیادہ بدتر لوگ دستکاری کرنے والے اور سنار ہیں)

ارشاد: اور طبرانی نے حضرت جابرؓ سے الفاظ ذیل روایت کیے ہیں:

وھبت خالتی فاختۃ بنت عمرو غلاما فامرتھا ان لا تجعلہ جازرا ولا صائغا ولا حجاما (کنز العمال ج ۲ ص ۲۰۱)

(میں نے اپنی خالہ فاختہ بنت عمرو کو ایک غلام ہدیہ پیش کیا اور یہ نصیحت کی کہ اس کو قصائی، سنار اور حجام نہ بنانا)

ارشاد: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من کانت تجارتہ الطعام بات و فی صدرہ غلٌ للمسلمین (رواہ ابن نعیم عن ابن عمر، کنز العمال)

(جس شخص کی تجارت غلہ کی ہوتی ہے اس کے دل میں مسلمانوں کی دشمنی سمائی رہتی ہے کہ وہ ہمیشہ گرانی کا خواستگار رہتا ہے۔)(۱۴)

مفتی محمد شفیع کی کتاب شائع ہونے کے بعد ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ہر چہار جانب سے اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ مختلف مکاتب فکر کے علماء اور دانشوروں نے تفاضل انساب کو اور مسئلہ کفاءت کی آڑ میں طبقاتی امتیازات کو فروغ دینے والے اس نظریہ کو باطل قرار دیا۔ محدث کبیر علامہ حبیب الرحمن اعظمی نے ان تمام روایات پر جرح کی اور صراحت فرمائی کہ ان احادیث کی سند کا کوئی پتہ نہیں ہے

محدثین نے ان کے غیر اصح ہونے کی تصریح کی ہے۔(۱۵)

مولانا عبدالجلیل سنی ناظم دارالعلوم شبلیاں ضلع بستی نے ۱۹۳۸ء میں فقہی کفاءت سے متعلق احادیث کی تحقیق کی اور انہیں موضوع قرار دیا۔ انہوں نے اخبار اہل حدیث میں ۱۳ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ (۱۲ مئی ۱۹۳۸ء) کی اشاعت میں لکھا:

"کفاءت کا مسئلہ محض ایک معاشرتی، اخلاقی اور سوسائٹی کی حیثیت رکھتا ہے، اسے کوئی شرعی اہمیت حاصل نہیں، ورنہ یہ اسلام کے شعار عام، اس کے مساوات عامہ اور عالمگیر دعوت کے تحت منافی ہوگا۔ مسلمانوں کی [illegible] امت کو دیکھیے، جہاں ان میں ہزاروں انواع و اقسام کے اختلافات موجود تھے، وہیں مسئلہ کفاءت کو بھی بنیاد رکھ کر اختلاف و تفرق کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کیا گیا۔ مسئلہ زیر بحث میں جس غلو سے کام لیا گیا ہے اور جن طویل و عریض تفریعات اور فقہی موشگافیوں کا مظاہرہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل کے لئے شرح وقایہ ج ۲ ص ۲۰-۲۱، نیز بحر رائق، ہدایہ، جامع الرموز، قاضی خاں، بدائع، تفسیر احمدیہ وغیرہ کتب فقہ کا مطالعہ کیجئے، جن میں نہایت تفصیل کے ساتھ لوہار، دربان، سائیس، دھوبی، روئی، سقہ، صراف، عطار، حجام، جولاہا وغیرہ کی تقسیمات و تفریعات سے سینکڑوں اوراق مملو نظر آئیں گے۔" (۱۶)

دلت سیاست کا عروج:

مسلم سماج میں اس طبقاتی امتیاز کو آزاد ہندوستان میں اس وقت اور فروغ ملا، جب کہ صدیوں سے مظلوم اور اپنے بنیادی حقوق سے محروم کردہ دلتوں، پچھڑوں اور پسماندہ ذاتوں نے سیاسی انگڑائی لی اور بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کے بعد آنجہانی کانشی رام نے دلتوں کو انتخابی سیاست میں متحد و منظم ہو کر حصہ لینے اور اپنی محرومیوں اور ناانصافیوں کا بدلہ چکانے کے لئے اسے موثر طور پر استعمال کرنے پر آمادہ کیا۔ کانشی رام نے ایک طویل عرصہ تک دلتوں کو متحد اور منظم کرنے کے لئے سماجی سطح پر منصوبہ بند طریقے سے کام کیا۔ وی ٹی راج شیکھر اور ادت راج جیسے دانشوروں اور سماجی کارکنوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے برہمنیت اور اس کے ظالمانہ ہتھکنڈوں پر کاری ضربیں لگائیں اور دلتوں کے اندر ہندو سماج کے استحصالی نظام کے خلاف بغاوت اور نفرت آمیز سخت ردعمل پیدا کیا اور اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھایا محترمہ مایاوتی اور ان کی سیاسی جماعت بہوجن سماج پارٹی نے۔ انہوں نے ہندو منو واد کے خلاف دلتوں اور پسماندہ ذاتوں کو صف آرائی کے لئے تیار کیا۔ "تلک، ترازو اور تلوار۔ ان پر مارو جوتے چار" کا سیاسی نعرہ لگایا۔

ذاتوں پر ان کی سیاسی گرفت اتنی مضبوط ہوئی کہ اتر پردیش جیسی بڑی ریاست میں وہ اپنی سیاسی شعبدہ بازیوں سے چار بار وزارت اعلیٰ کی کرسی پر براجمان ہوئیں۔ انہوں نے ۲۰۰۷ء کے حالیہ اسمبلی

انتخابات میں سوشل انجینئرنگ کا فارمولہ بھی اپنایا اور بہوجن سماج کی جگہ "سروجن سماج" کا نعرہ بلند کر کے دلتوں اور پسماندہ و نچلی ذاتوں کے علاوہ برہمنوں اور اونچی ذاتوں کو بھی سیاست میں حصہ داری دینے کا نعرہ بلند کیا۔ اس صورت حال میں مسلم پسماندہ ذاتوں اور درج فہرست برادریوں کو بھی انہوں نے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔

محترمہ مایاوتی کی دلت سیاست نے ہندوستان کی انتخابی سیاست کو ایک نیا رخ عطا کیا۔(۱۷) یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ دوسرے سیاسی رہنما جیسے ملائم سنگھ یادو، لالو پرساد یادو، رام ولاس پاسوان وغیرہ بھی طبقاتی سیاست بازی میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ انہوں نے ذات پات اور برادری کی بنیاد پر اپنے سیاسی مفادات کے حصول میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر محترمہ مایاوتی کی دلت سیاست نے ہندوستان میں طبقاتی سیاست کو سب سے زیادہ مستحکم کیا اور وہ رفتہ رفتہ ذات پات کی سیاست کی علامت بن گئیں۔(۱۸)

مسلمانوں کی پسماندہ برادریاں، جو علماء کرام کی ناقص مذہبی تشریحات سے پہلے ہی غیر مطمئن تھیں اور تعلیم اور معاش کے روز افزوں مواقع نے ان کو کسی قدر بیدار اور خودی آشنا بنا دیا تھا، دلت سیاست کے کامیاب تجربہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اشراف واجلاف کی نام نہاد مذہبی تقسیم اور علماء کے زمین دارانہ مزاج نے انہیں پہلے سے ہی حاشیہ پر لا کھڑا کیا تھا اب وہ امت واحدہ کی قرآنی روح اور تفہیم اخوت اسلامی کے جذبات سے بے پرواہ ہو کر ذات برادری کی بنیاد پر تشکیل کردہ انجمنوں، جماعتوں اور جمیعتوں کو اپنے درد کا درماں سمجھ کر ان میں جوق در جوق شامل ہونے لگیں۔ مسلم امت میں ایسے دانشور، علماء اور سماجی کارکن ابھر کر سامنے آئے، جنہوں نے ذات برادری کی بنیاد پر مسلم مفادات کی تحصیل کو اپنا نصب العین بنایا۔ ایسے مضامین، سیاسی بیانات، مراسلے اور انٹرویو شائع ہوئے، جن میں مسلمانوں کو ذات برادری کی بنیاد پر متحد ہونے اور اپنا سیاسی و سماجی پلیٹ فارم تشکیل دینے پر زور دیا گیا۔ جمعیۃ القریش، آل انڈیا مومن کانفرنس، جمعیۃ الانصار، مسلم تیلی کانفرنس، مسلم پسماندہ محاذ، اکھل بھارتیہ مسلم کلک سماج، جمعیۃ الراعین، جمعیت عباسی، سیفی برادری، انجمن سادات، انجمن پٹھانان ہند، جمعیۃ المنصورین وغیرہ مختلف ناموں سے سیاسی، مذہبی اور سماجی منصوبوں کی تکمیل کے لئے مہم چلائی گئی۔ اس نامطلوب تحریک کے جلو میں بعض اصلاحی اور تعلیمی پروگرام بھی روبہ عمل لائے گئے۔ شادی بیاہ میں فضول خرچیوں اور غیر اسلامی رسوم کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے لئے ادارے کھولے گئے اور تعلیمی وظائف بھی جاری کئے گئے ساری تگ و تاز کا محور بالخصوص برادری اور پیشہ سے وابستہ افراد۔ امت واحدہ کو مخاطب نہیں بنایا گیا اور مسلمان بحیثیت ملت اپنی شناخت کھو کر ذاتوں اور برادریوں میں تحلیل ہوتے رہے۔

ریزرویشن کی تحریک:

ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ کوئی ہنگامی وجذباتی سیاست یا ذہنی اور خیالی کی پیداکردہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخی مطالبہ کی تجدید ہے جسے آزاد ہندوستان میں ساٹھ سال کے تجربہ کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل نے پورے ہوش وحواس کے ساتھ اٹھایا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مفادات پر بحث ہو رہی تھی اور مسلمانوں کے ریزرویشن کی تجویز زیر غور تھی اور پنڈت جواہر لال نہرو اس تجویز کی حمایت میں تھے تو اس وقت سردار پٹیل جیسے لوگوں نے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ مسلمانوں کو ان کا حصہ دینا اکثریتی فرقہ کی اخلاقی ذمہ داری ہوگی۔ مسلمان ریزرویشن کے ذریعہ اسے قانون میں شامل کرنے پر اصرار نہ کریں۔ اس یقین دہانی پر مسلمانوں نے ریزرویشن کے مطالبے سے دستبرداری اختیار کر لی تھی لیکن آزاد ہندوستان کی سیاست میں جو کچھ اب تک ہوا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اخلاقی ذمہ داری کا احساس اکثریتی طبقہ کے اندر پیدا ہی نہیں ہوا اور ہندو اور مسلمان اس ملک میں دو فریقوں میں محدود نہ رہے بلکہ متعدد طبقوں اور گروپوں کے مفادات کی کش مکش خود اکثریتی فرقے کے اندر شروع ہوگئی۔ اسی کش مکش نے ریزرویشن کے قانونی احترام کو ہندوستانی عوام کی ایک ناگزیر ضرورت ثابت کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ریزرویشن کا مطالبہ اسی ناگزیر ضرورت کی تکمیل کے لئے ہوا۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ دلت اور پسماندہ طبقوں کو تعلیم گاہوں اور سرکاری مشنری میں شامل کرنے میں ریزرویشن کے بندوبست نے بڑا کام کیا ہے۔ جو طبقے معاشرے سے کٹے ہوئے تھے، جن کی کہیں کوئی نمائندگی اور حصہ داری نہیں تھی، جن کے اندر اوپر اٹھنے کا حوصلہ بھی پیدا نہیں ہو رہا تھا وہ اسی آئینی بندوبست کی وجہ سے آج سے پہلے بہت بہتر حالت میں پہنچ گئے ہیں لیکن مسلمان جو معاشرہ اور نظام کا اٹوٹ حصہ تھے، بلکہ تقسیم سے پہلے کے ہندوستان میں جو نمایاں حیثیت رکھتے تھے، آزادی کے بعد بھی جن کی نمائندگی نظر آتی تھی، ترقی اور آزادی کے ان ساٹھ سالوں میں وہ محض اس وجہ سے پیچھے ہوتے گئے کہ ان کے مفادات کو تحفظ نہیں دیا گیا، جب کہ انہیں محروم اور نظر انداز کرنے کے جذبات ورجحانات ایک اثر دار طبقے میں شدت کے ساتھ موجود رہے اور پوری سرکاری مشینری ان کے تئیں تعصب میں مبتلا رہی۔(۲۰)

آج مسلم دانشور سخت مضطرب ہیں کہ اس سرزمین پر آٹھ صدیوں تک حکومت کرنے کے باوجود آج مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ ہزاروں برس سے ذلت کی زندگی بسر کرنے والا دلت طبقہ سلطانی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر حقائق کی دنیا میں اتر کر دیکھئے تو جوتے چپل بنانے والے مسلمانوں کی تعداد لگ بھگ ۸۵ فیصد ہے۔ پورے ملک میں سڑک کے کنارے موٹر کے پنکچر بنانے والے ۹۸ فیصد

مسلمان ہیں۔ بنکر اور سلائی کے کام میں نوے پچانوے فیصد مسلمان ہیں۔ بیڑی، اگربتی بنانے، انڈا، مرغی، گوشت بیچنے میں کون سا سماج زیادہ مشغول ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کچرا چننے، بھالو، بندر سانپ نچانے، بھنگی گیری کرنے، پاسی گیری، دائی گیری وچاکری میں دن بدن مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے ۶۰ برسوں میں چھوٹے چھوٹے پیشے کرنے والا دلت طبقہ آگے بڑھ گیا ہے اور اُس کی چھوڑی ہوئی جگہوں کو مسلمان وطن پُر کر رہے ہیں اور اب اُسی ذات کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ بعض تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ اس صورت حال کی ایک وجہ دستور ہند کی دفعہ ۳۴۱ میں مذکور مذہبی قید ہے۔(۲۱)

ڈاکٹر ایم اعجاز علی ریزرویشن کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء میں جب شیڈولڈ کاسٹ کے نام پر ریزرویشن کا آغاز ہوا تو اس میں مسلمان اہم پیشہ بھی شامل تھے اور مسلمانوں کی آبادی کا لگ بھگ ۸۵ فیصد حصہ ریزرویشن کا حقدار تھا۔ مہاراشٹر کی تقریباً ۱۳ مسلم برادریوں نے اس کا فائدہ اٹھایا کیونکہ اس وقت کے گورنمنٹ آرڈر میں صرف ہندوستانی عیسائیوں کو ریزرویشن سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ مگر دلت مسلمان اُس وقت بے انصافی کا شکار ہوئے، جب دفعہ ۳۴۱ کے ذریعہ جاری شدہ صدارتی حکم نامہ ۱۹۵۰ء کے پیراگراف ۳ میں یہ بات تحریر کردی گئی کہ شیڈولڈ کاسٹ ریزرویشن سے مستفید ہونے کے لئے ہندو ہونا لازمی شرط ہے۔ یہ شرط صرف اس زمرے سے باہر کرنے کے لئے ہی لگائی گئی تھی کیونکہ عیسائی قوم تو پہلے سے ہی اس سے باہر تھی۔ بدھ مت کے پیروؤں کی آبادی صفر کے برابر تھی اور ہندو شرط لاگو ہونے کے باوجود سکھوں کی دلت آبادی کو ریزرویشن جاری رکھا گیا تھا، جسے ماسٹر تارا سنگھ کے دباؤ میں ۱۹۵۶ء میں حتمی طور پر دستور ہند میں لکھ دیا گیا۔ صدارتی حکم نامہ ۱۹۵۰ء اور سرکاری حکم نامہ ۱۹۵۹ء یہ دونوں دستور ہند کے سیکولر مزاج کے منافی ہیں، لیکن جب پارلیمنٹ ہی مسلم مخالف ہو تو کیسا سیکولرزم یعنی جمہوریت اور کیسا آئین؟(۲۲)

بیسویں صدی کی نویں دہائی میں منڈل کمیشن کی تشکیل اور اس کی سفارشات کی تنفیذ نے مسلمان دلتوں اور پسماندہ برادریوں کو سیاسی محاذ پر منظم اور متحد کردیا۔ گرچہ اس صدی کی تیسری دہائی میں عبدالقیوم انصاری مرحوم نے آل انڈیا مومن کانفرنس کی تاسیس کر کے چھوٹی اور پسماندہ برادریوں کی تنظیم شروع کردی تھی مگر مابعد منڈل حالات میں اس تحریک نے زور پکڑا اور ملک بھر میں دو مختلف جمعیتیں وجود میں آگئیں۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر ایم اعجاز علی نے آل انڈیا مسلم یونائیٹڈ مورچہ قائم کیا اور ۱۹۹۸ء میں علی انور نے آل انڈیا پسماندہ مسلم محاذ کی بنیاد رکھی اور دوسری مختلف تنظیمیں بھی دوسری ریاستوں میں تشکیل پاگئیں۔ دھیرے دھیرے اس تحریک میں شدت اور قوت آ گئی اور اس نے مسلمانوں میں

ملت واحدہ کے تصور کو مضبوط کرنے کے بجائے طبقاتی سیاست کو اور پسماندہ برادریوں کے اندر وحدت کو استحکام بخشا۔

پسماندہ برادریوں کی اس تحریک نے مسلمانوں کے اجتماعی شعور، ملی تشخص اور اسلامی تہذیب پر کاری ضرب لگائی۔ اس نے بابری مسجد تحریک، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، یونیفارم سول کوڈ کے خلاف ملی جدوجہد، اردو کی بقا وتحفظ کے لئے چلائی گئی ملی مہم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کی اجتماعی کوشش وغیرہ وتمام تحریکوں پر مبنی دعاوی و غالب اشرافیہ ذہنیت کو چیلنج کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مسلمانوں کا تشخص کم از کم تین طبقوں میں منقسم ہے: اشراف (اعلیٰ ذات کے معزز مسلمان)، اجلاف (درمیانی طبقہ یا شودر) اور ارذال (پسماندہ ذاتیں یا دلت) اور ان تینوں طبقوں کا تشخص، ان کے معاشرتی وسیاسی مسائل اور ان کے مفادات متضاد ایک دوسرے سے مختلف اور بسا اوقات متصادم ہیں۔ اس تحریک نے استدلال کیا کہ ہندوستان میں موجود دوسری قوموں کی طرح مسلم قوم بھی مختلف طبقات اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کے مختلف ومتنوع مفادات ہیں۔ اس لئے جب یہ تحریک "معاشرتی انصاف" کا مطالبہ کرتی ہے اور "مسلم قوم کے اندرونی اختیارات میں اور حکومت کی متعددہ ایجنسیوں میں متناسب نمائندگی" پر زور دیتی ہے تو بطور خاص مسلم معاشرہ کی جمہوریت کاری کو اور بطور عموم ہندوستانی معاشرہ اور ریاست کے اندر لوکتنتر کو بڑھاوا ملتا ہے:

It (Pasmanda Movement) suggests that just like any other community Muslims too are a divided house with different sections harbouring different interests. it stresses that the emotive issues raised by elite Muslims engineer a 'false consciousness' (to use a Marxien term) and that this euphoria around Muslim identity is often generated in order to bag benefits from the state as wages for the resultant de-politisisation of common Muslim masses. when PM raises the issue of social justice and proportional representation in power structures (both the community and state controlled) for the Pasmanda Muslims it lends moventum to the process of democratisation of Muslim society in particular and Indian state and society in general [23]

دستور ہند میں مذہب کی بنیاد پر کسی قومیت، طبقہ، فرقہ، ذات، برادری اور گروہ کے ریزرویشن کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ پروفیسر امتیاز احمد اسی لئے زور دیتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن اگر دیا گیا تو اس کا فائدہ وہی اٹھائے گا جس کے پاس تعلیم، صلاحیت اور خوشحالی ہے۔ مسلمانوں کی ۴۰ فیصد آبادی ریزرویشن کا فائدہ نہیں اٹھا سکتی کیونکہ مجموعی لحاظ سے اس کے پاس وہ صلاحیت اور قابلیت

ہی نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمیں ان مسلمانوں کی فکر کرنی چاہیے جو آج کی تاریخ میں زیادہ دبے ہوئے ہیں۔ مسلمان خود سماجی اعتبار سے بٹے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ سارے مسلمان ایک ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہے، مگر حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ چاہے سماجی اعتبار سے ہو یا معاشی اعتبار سے۔ اس کا ایک علاج یہ ہوسکتا ہے کہ او بی سی اور ایس سی کی فہرست میں مسلمانوں کی ان ذاتوں کو شامل کیا جائے جن کی حیثیت قریب قریب انہی طبقوں جیسی ہے۔ مگر یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ ہمارا اشرافیہ طبقہ حکومت پر اثر ڈالے۔ (۲۴)

عام مسلمان دانشور، ملی و مذہبی تنظیمیں، دینی و تعلیمی تحریکات اور ان کے سربراہان کا عمومی مطالبہ وہی ہے جس کا اعادہ مسلم مجلس مشاورت اپنے اجلاس میں بار بار کرتی رہی ہے۔ ۱۰ رجون ۲۰۰۹ کے ایک ایسے ہی اجلاس میں اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے اعلیٰ تعلیم میں اور سرکاری ملازمتوں میں علیحدہ دس فیصد کوٹہ مقرر کیا جائے اس لئے کہ ملازمتوں کے لئے موجودہ اسکیم کے تحت اور اعلیٰ تعلیم میں مجوزہ اسکیم کے مطابق مسلمان بحیثیت مجموعی پسماندہ زمرے میں آتے ہیں۔ مسلم مجلس مشاورت نے یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ تمام یونیورسٹیوں میں اور سرکاری امداد یافتہ یا سرکاری پیشہ وارانہ تعلیمی اداروں میں پسماندہ طبقات کے لئے کوٹہ مقرر کیا جائے اور یہ کوٹہ ہر ایک ذیلی طبقہ مثلاً ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور اقلیتوں کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے ان کی پسماندگی کی سطح کی رعایت سے الگ الگ قائم کیا جائے۔

دلت مسلمانوں اور مسلم پسماندہ ذاتوں اور برادریوں کے ریزرویشن کی اس تحریک نے ملی مفاد کو نقصان پہنچایا، مسلمانوں کے اندر موجود طبقاتی تقسیم کو فروغ دیا اور اس کے حق میں عقلی بنیادیں بھی فراہم کیں۔ اور یہ ساری بحث اسلام کے تصور امت واحدہ کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی رہی۔ مسلم تشخص مجروح ہوتا رہا اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے وجود و بقا کے لئے سوالیہ نشان قائم ہوتا رہا۔

حواشی و تعلیقات:

(۱) ڈاکٹر محمد عمر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی، ص ۸۷

(۲) ڈاکٹر یشو رویا، ہمارا ثقافتی ورثہ، ص ۷۹۔۸۹ بحوالہ ڈاکٹر اشفاق محمد خان (مرتب)، ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کے مسائل، ہیریٹیج پبلشرز، بک ہاؤس بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی، طبع اول ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۰

(۳) محمد اقبال، کلیات اقبال، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی، مئی ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۶

(۴) جون ۲۰۰۵ء میں صوبہ اترپردیش کے ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں چرتھاول میں عمرانہ نام کی ایک مسلمان خاتون

کے ساتھ اس کے سسر محمد علی نے زنا کا ارتکاب کیا، جس پر دارالعلوم دیوبند نے ۲۷ رجون ۲۰۰۵ کو فتویٰ دیا کہ سسر کی بدکاری کی وجہ سے عمرانہ اب اپنے شوہر کے لئے حرام ہوگئی اور ان دونوں میں علیحدگی ناگزیر ہے۔ یہ معاملہ بڑا حساس اور نازک تھا، چنانچہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے اس کی خوب تشہیر کی اور شریعت اسلامی کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اخبارات میں فقہ حنفی کے علاوہ دوسرے فتاویٰ بھی شائع ہوئے اور فقہ شافعی، فقہ مالکی اور فقہ جعفری کی آرا بھی سامنے آئیں کہ حرمت مصاہرت زنا سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے سسر کو اس کی بدکاری کی سزا ملے گی مگر عمرانہ پر اپنے شوہر فوراتی سے علیحدگی لازم نہیں ہے۔ اس پر دیوبند کے علماء نے اپنی حمایت میں مراسلے اور مضامین شائع کرائے اور وہ اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس تکلیف دہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا طارق حمود مجلس علمی ماہنامہ "ندائے اصفا" نئی دہلی ج ۲ شمارہ ۲۰، ۳۰ اگست۔ ستمبر ۲۰۰۵ کے اداریہ میں لکھتے ہیں: "اسلام میں برہمنیت نہیں ہے کہ وہ صرف ایک مخصوص ذات کے لوگ پڑھ سکے بلکہ اس کی تعلیمات اور پیغام کو واضح کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ ہم اس کی تہہ تک پہنچیں، اگر کتاب و سنت سے اس کی معقولیت ثابت کر سکتے ہوں تو سامنے آئیں ورنہ پھر اس بات کا اعتراف کریں کہ ہمارے بعض محترم فقہاء نے زنا بالجبر کے ذریعے حرمت مصاہرت کے ثبوت کی بات کہی ہے ان کے دلائل کمزور ہیں، اس لئے ان کو تسلیم کرنے کی کوئی ذمہ داری ہمارے اوپر عائد نہیں ہوتی ہے"۔ (ص ۳۔۵)، مولانا مسعود عالم فلاحی کی کتاب "ہندوستان میں ذات پات اور مسلمان" القاضی نئی دہلی ۲۰۰۷ء، اسی برہمنیت زدہ اسلام اور مسلم معاشرے کو بے نقاب کرنے کی ایک مدلل کوشش ہے۔ یہ بحث زیادہ تر اسی کتاب سے ماخوذ ہے اور اس کے لئے راقم فاضل مصنف کا ممنون ہے۔

(۵) ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی آئین کی ترویج و تنفیذ۔ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۹

(۶) سید سلیمان ندوی، ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی؟ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۳۴ء، ج ۱۳ شمارہ ۱، ص ۱۳۔۳۰

(۷) سید ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، اردو ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق، اردو سائنس بورڈ لاہور، جولائی ۱۹۸۳ء، طبع دوم، ص ۹۰۔۹۳

(۸) ڈاکٹر کنور محمد اشرف، ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، اردو ترجمہ قمر الدین، انجمن ترقی اردو ہند/ترسٹ انڈیا نئی دہلی ص ۸۳۔۱۴۱، بحوالہ امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا جلد ۲ ص ۳۲۳

(۹) ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی، معالم السنن، تصحیح محمد راغب الطباخ، طبع اول ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء، ج ۳، ص ۲۰۷

(۱۰) سلطان احمد اصلاحی، اسلام کا تصور مساوات، مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۸۔۲۲۹

(۱۱) بروایت مولانا عتیق احمد بستوی، دیکھئے مقاصد شریعت۔ تعارف اور تعلیق، ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی، جولائی ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۲۔۲۰۵

(۱۲) مفتی محمد شفیع، نہایات الارب فی غایات النسب مع رسالہ مفیدہ از مولانا صوفی العلماء محمد اشرف علی تھانوی، مطبع دار الاشاعت دیو بند، ۱۳۵۱ھ ص ۳ بحوالہ مسعود عالم فلاحی، حوالہ بالا، ص ۳۲۷۔۳۲۸

(۱۳) مفتی محمد شفیع، نفس مصدر، ص ۶

(۱۴) نفس مصدر، ص ۱۵

(۱۵) حبیب الرحمن الاعظمی، انساب و کفاءت کی شرعی حیثیت، المجمع العلمی مرکزی تحقیقات و خدمات علمیہ، مولانا محمد بجنین، ۱۹۹۰ء، ص ۵۹

(۱۶) اخبار اہل حدیث ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ بحوالہ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری، فتاویٰ ثنائیہ، مرتب مولانا محمد داؤد راز، تحشیہ: شیخ الحدیث مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی، جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی اکتوبر ۲۰۰۲ء، ج ۲ ص ۱۸۱۔۱۸۲

(۱۷) ذات برادری کی اس مذموم سیاست سے کل ہند سطح کی مرکزی سیاسی جماعتیں جو سیکولرزم اور اصول سیاست کا دم بھرتے نہیں تھکتیں، وہ بھی کنارہ کش نہ رہ سکیں۔ یونائیٹڈ پروگریسو الائنس (متحدہ ترقی پسند محاذ) کی چیئرپرسن محترمہ سونیا گاندھی نے سابق نائب صدر جمہوریہ بابو جگ جیون رام کی دختر میرا کمار کو لوک سبھا اسپیکر کے عہدے پر فائز کر کے دلت سیاست کے ماہاوتی ووٹ بینک میں سیندھ لگانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے یوں مایاوتی کو چاروں شانے چت کر دیا ہے۔ دیکھئے ہیرالال کردم باپوڑ کا مضمون "کیا بی ایس پی کی سربراہ ان سوالوں پر غور کریں گی؟" سہ روزہ "دعوت" دہلی، ۱۱ر جولائی ۲۰۰۹ء

(۱۸) یہ بات صحیح ہے کہ کانگریس کی دلت لیڈر میرا کمار نے لوک سبھا کی اسپیکر منتخب ہو کر ایک نئی تاریخ بنائی ہے ورنہ ملک کی تاریخ میں پہلی بار ۱۹۹۸ء میں تیلگو دیشم کے جی ایم سی بالیوگی دلت اسپیکر منتخب ہوئے تھے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے پارلیمنٹ میں ڈپٹی اسپیکر کے لئے دلت کارڈ کھیلا تو مجبور ہو کر کانگریس نے بی جے پی کو شکست دینے کے لئے میرا کمار کو منتخب کرا دیا۔ اس سے پہلے کے آر نارائنن کو دلت صدر جمہوریہ بننے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ سپریم کورٹ کے موجودہ چیف جسٹس کے جی بالا کرشنن بھی دلت طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد رفتہ رفتہ دلتوں کو ملک کے اعلیٰ اور باوقار عہدوں پر فائز ہونے کا موقع ملا ہے مگر اس سے ان کی معاشی، تعلیمی، سیاسی اور سماجی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی ہے اور دوسری بات یہ کہ صرف کریمی لیئر طبقہ سے تعلق رکھنے والے دلت افراد ہی ان مواقع سے مستفید ہو رہے ہیں اس فرقہ کے عام لوگ اب بھی ترقی کرنے کے ان مواقع سے محروم ہیں، حالانکہ آئین ہند نے انہیں تمام حقوق عطا کر رکھے ہیں۔ دیکھئے محمد آصف علی کا مضمون

"انفرادی ترقی کمیونٹی کی پہچان نہیں ہے"۔ سہ روزہ "دعوت" دہلی، ۲۸ر جون ۲۰۰۹ء

(۱۹) راقم ابھی اس مضمون کی ٹوٹ پھوٹ درست کرنے میں مصروف تھا کہ روزنامہ "راشٹریہ سہارا" نئی دہلی کی اشاعت ۲۳ر نومبر ۲۰۰۹ء میں مراسلات کے کالم میں محفوظ احمد سہارنپوری (ایڈووکیٹ) بازار دالان سہارنپور کا ایک خط نظر سے گزرا۔ معلوم ہوا کہ ان کے شہر کے کسی علاقہ میں بیاکالا اسلام چک کی جانب سے سیمینار منعقد کیا گیا، جس میں خوشحال کاشت کار مسلم برادری گاڑا کے افراد جمع ہوئے۔ سیاسی حصہ داری کے مسئلہ پر گفت و شنید کے لئے مراسلہ نگار نے اس پر کرب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس برادری کے اجتماع نے تعلیم، روزگار، سیکورٹی، صحت، اصلاح معاشرہ، وراثتوں کے تحفظ وغیرہ کسی مسئلہ پر بھی غور نہیں کیا جب کہ یہ وہاں کا گاؤں ہے جہاں اس برادری کی غالب اکثریت رہتی ہے، چودہ سو پچاس افراد رہتے ہیں۔ یہ مخلوط آبادی مسلم اور غیر مسلم دونوں پر مشتمل ہے۔ اس گاؤں کا صرف ایک مسلمان نوجوان انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد پالی ٹیکنک میں داخلہ پا سکا ہے جب کہ اسی گاؤں کی غیر مسلم آبادی نے سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں ملازمت پذیر ہو کر انجینئر، ایک ایم ڈی ڈاکٹر، ایک پولیس افسر اور ایک انٹر کالج منیجر پیدا کیا ہے۔ کسی زمانہ میں مزدوروں کی یہ آبادی آج گاؤں کی مسلم آبادی کی بہ نسبت زیادہ خوشحال ہے۔ اب مسلمانوں میں تعلیم کے تئیں کچھ بیداری پیدا ہوئی ہے اسی لئے گاؤں کے سرکاری اسکول کے ۶۹ بچوں میں تقریباً ۸۵ فیصد مسلمان ہیں۔ ان میں بھی زیادہ تر صرف اخیف ملے کے دن تک دکھائی دیتے ہیں جب کہ برادر وطن کے صرف وہ بچے جو کمزور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس سرکاری اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ باقی تمام بچے شہر کے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ مگر فرزندان ملت آج بھی اکثر کسی تالاب کے کنارے چھوٹی مچھلیاں پکڑتے ہوئے آپس میں گالم گلوچ کرتے اور تھم گتھا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ مراسلہ نگار نے بجا طور پر تشویش ظاہر کی ہے کہ زیادہ تر مسلم سماج کے یہ سیمینار، سمیلن اور کانفرنسیں "سماجی قدر کے متلاشی لوگوں کے ذریعہ منعقد کی جانے والی ایسی بے سود کوششیں ہیں جن سے ملت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ البتہ ان کے ذریعہ ملت کو غیر ضروری بحث و مباحثہ میں ڈال کر تعمیری فکر سے دور رکھنے کی سازشیں" کرتی رہیں۔ "پچھلے چند سالوں سے تیلی سمیلن، گاڑا سمیلن، گوجر سمیلن وغیرہ کی شکل میں ایک نیا ٹرینڈ رواج پا رہا ہے۔ پہلے سے ہی کیا یہ بد نصیب ملت کم گروہ بندی کا شکار ہے، جو اس کی کمی بھی پوری کی گئی۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ سیاسی حصہ داری ہمارے بہت سے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے مگر حقیقی اتحاد کا فقدان ہمارے تمام مسائل کی بنیاد ہے"۔

(۲۰) دیکھئے ڈاکٹر منظور عالم کا مضمون "خواتین ریزرویشن سے پہلے مسلم ریزرویشن ضروری" سہ روزہ "دعوت" دہلی، ۲۸ر جون ۲۰۰۹ء۔ مضمون نگار نے خواتین کے لئے ریزرویشن بل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کے خیال میں زیر غور بل ملک کی تمام عورتوں کے مفادات کا تحفظ نہیں دیتا۔ یہ ان عورتوں کو ہی با اختیار بنائے گا جو پہلے ہی خود مختار ہیں، جنہیں نہ صرف اعلیٰ طبقات کی عورت ہونے کی وجہ سے پالیسی اور سیاست میں کام کرنے کی وجہ

سے حسن کے مقابلے بیٹھنے کی وجہ سے، یا کچھ سیاسی رسماجی مراعات حاصل ہونے کی وجہ سے یہ موقع حاصل ہے کہ وہ سیاسی ایوانوں کی زینت بن سکیں۔ دلت، آدی واسی، پسماندہ، قبائلی اور دیگر کمزور طبقات کی عام عورتیں اس میں پیچھے ہی رہیں گی۔ ان کا حال وہی ہوگا جو اوبی سی کے ریزرویشن میں کمزور طبقوں کا ہے۔

(۴۱) ریزرویشن۔ مسلمان کیا کریں؟ ڈاکٹر ایم اعجاز علی، قومی صدر آل انڈیا پسماندہ مسلم مورچہ، سہ روزہ ''دعوت'' نئی دہلی ۱۰ رنومبر ۲۰۰۶ء

(۴۲) شیڈولڈ کاسٹ ریزرویشن سے مسلمانوں کی محرومی کی ایک عبرتناک مثال ڈاکٹر کیشن (جو مہتر ذات سے تعلق رکھتے ہیں) کی ہے جو ہندوازم کو خیرباد کہہ کر ۲۰۰۶ء میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تو دستور ہند کی دفعہ ۳۴۱ کے تحت انہیں شیڈولڈ کاسٹ ریزرویشن کی مراعات سے بے دخل ہونا پڑا۔ اس تعلق سے جب انہوں نے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ججوں کی پانچ نفری ایک بنچ نے مرکزی سرکار سے اس کے تعلق سے سوال کردیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دفعہ ۳۴۱ جو شیڈولڈ کاسٹ کی شناخت دیتی ہے اس میں کسی طرح کی خرابی نہیں ہے لیکن صدارتی حکم نامہ ۱۹۵۰ء کے پیراگراف (۳) کے ذریعہ ہندو ہونے کی لازمی شرط لگا کر اس دفعہ کو جہاں ایک طرف فرقہ وارانہ بنا دیا گیا وہیں دوسری طرف اس سے مذہبی آزادی کے حق کا گلا بھی گھونٹ دیا گیا۔ اس غیر سیکولر عمل کو اس وقت اور تقویت ملی جب ۲۳ رجولائی ۱۹۵۹ء کو سرکار کا ایک آرڈر جاری آیا، جس کے مطابق کوئی ہندو دلت اگر پھر سے ہندوازم کو قبول کرلے تو اسے شیڈولڈ کاسٹ کی سہولت پھر سے مل سکتی ہے۔ یہ دونوں حکم نامے آج ہمارے آئین کا حصہ بن چکے ہیں جس کی بنیاد سیکولرزم ہے۔ دیکھئے ڈاکٹر ایم اعجاز علی کا مضمون ''مہتر سے مسلمان ہونے ڈاکٹر کی بے بسی'' سہ روزہ ''دعوت'' دہلی ۲۸ رنومبر ۲۰۰۶ء

(۴۳) Khalid Anis Ansari, Rethinking the Dalit Muslim Movement, Economic and Political Weekly, March 28, 2009, Vol.XLiv, No.13, the author, a member of a research- activism group called the Patna Collective may be accessed at khalidanisansari@gmail.com

پسماندہ محاذ کی اس جدوجہد کو بعض دانشوروں نے ''مسلمانوں کو منتشر کرنے کی سیاسی کوشش'' سے تعبیر کیا ہے جس میں کچھ لوگ سیاسی شعبدہ باز لیڈروں کے آلۂ کار بن کر ایک ''خیالی پلاؤ'' کی تقسیم کی لڑائی میں لگ گئے ہیں۔ ''ریزرویشن کی صورت میں ابھی سوت کپاس تو مسلمانوں کو ملا نہیں، مگر آپس میں لٹھم لٹھا شروع ہوگئی''۔ دیکھئے ڈاکٹر ایم۔ جے۔ حسن کا مضمون ''ریزرویشن۔ انصاف یا خیرات'' سہ روزہ ''دعوت'' دہلی ۳۰ رمئی ۲۰۰۶ء

(۴۴) پروفیسر امتیاز احمد کا انٹرویو، حکومت کوٹہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا، سہ روزہ دعوت دہلی ۱۶ رنومبر ۲۰۰۶ء

(۴۵) مسلم مجلس مشاورت کی قرارداد، سہ روزہ دعوت دہلی، ۱۹ رجون ۲۰۰۶ء، نیز دیکھئے شفیق الرحمن کا مضمون ''مسلمانوں کو بھی ریزرویشن کا مستحق قرار دیا جانا چاہئے'' سہ روزہ ''دعوت'' دہلی ۱۶ رنومبر ۲۰۰۶ء

☆☆☆

مسلم معاشرہ کے مسائل اور اسباب

مولانا محمد طاہر مدنی
(ناظم جامعۃ الفلاح)

مسلم معاشرہ قرآن وسنت کی بنیاد پر تشکیل پانے والا وہ معاشرہ ہے جو اپنی خصوصیات وامتیازات کے لحاظ سے عام انسانی معاشرہ میں ممتاز ہوتا ہے اس معاشرہ کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت کے ایسے مضبوط عقائد پر استوار ہے جو مستحکم اور ٹھوس ہیں وحدت الٰہ اور وحدت بنی آدم اس معاشرہ کی امتیازی خصوصیات اور باہمی تعاون وتناصر اس کی پہچان ہیں۔ نبی کریمؐ کی تربیت کے نتیجہ میں جو معاشرہ بنا اس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ''محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم، تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا، سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود، ذالک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل'' یہ مثالی معاشرہ رہتی دنیا تک ایک مشعل راہ ہے جس سے رہنمائی اور روشنی ملتی رہے گی۔

آج کا مسلم معاشرہ اپنی بنیادوں سے دور ہونے کی وجہ سے مختلف النوع مسائل سے دوچار ہے اور اپنی انفرادیت وپہچان کھوتا جارہا ہے ان مسائل میں چند اہم یہ ہیں:

۱- قرآن وسنت سے دوری:

مسلم معاشرہ کی بنیاد اللہ کی کتاب اور رسول اکرمؐ کی سنت ہے۔ قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامے بغیر اس معاشرے کی تشکیل ہی نہیں ہوسکتی۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے ''ترکت فیکم امرین، لن تضلوا ما تمسکتم بھما، کتاب اللہ وسنتی'' ہمارے لئے معیار ردوقبول کتاب وسنت کا پابند ہی ہونا چاہئے، بقیہ چیزیں اس کے بعد آتی ہیں۔ لیکن آج ترتیب ہی الٹ گئی ہے۔ کتاب وسنت سے بے اعتنائی ہے حتی کہ طبقہ علماء میں بھی صحیح ترتیب کا فقدان ہے دین نیچے اور مسلک اوپر ہے جب تک قرآن وسنت کو اصل مقام نہیں دیا جاتا اس وقت تک ہمارے معاشرے کی تشکیل صحیح نہیں ہوسکتی۔

۲- افتراق وانتشار:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا'' اتحاد ویکجہتی ہماری قوت کا راز ہے۔ ہمارا دین ہمارا عقیدہ، ہمارا نصب العین ایک ہے اس نصب العین سے غفلت کی وجہ

سے ہمارا اتحاد کمزور ہو گیا ہم منتشر ہو کر کمزور ہو گئے اور اس ہدایت الٰہی کو ہم نے نظر انداز کر دیا کہ "ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم" عقیدہ سے کر عبادات تک ہر جگہ ہم واحدہ یکجہتی کی تعلیم ملتی ہے اسے آج مضبوط کرنے کی ضرورت ہے اور ہر سطح پر انتشار کو ختم کرنا از بس ضروری ہے۔ آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن باہم جوڑنے والے امور بہت زیادہ ہیں ان پر دھیان مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

۳- اونچ نیچ اور بھید بھاؤ:

اسلام نے وحدت بنی آدم کا تصور دیا ہے اور قرآن مجید میں یہ واضح اعلان کیا گیا ہے "یا ایها الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند الله اتقاکم ان الله علیم خبیر" اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تخلیق ایک جوڑے سے کی ہے شرف انسانیت کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ "ولقد کرمنا بنی آدم" کا واشگاف اعلان قرآن نے کیا ہے یہاں اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ انسان اپنے عمل سے اوپر اٹھتا ہے نبی کریم کا ارشاد ہے: جس کو اس کا عمل پیچھے کر دے اسے اس کا نسب آگے نہیں کر سکتا یہاں تو یہ عالم ہے کہ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ آج اس معیار سے گر گیا۔ خاندان اور نسب کی بنیاد پر تفاخر کی جاہلانہ رسم کا شکار ہو گیا۔ اقبال نے کہا تھا۔

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو

یہ کمزوری مسلم معاشرہ کا بہت سنگین مسئلہ ہے جسے دور کرنے کی ضرورت ہے اور انسانوں کی برابری کا وہ نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے جو اسلام میں مطلوب ہے ایسی صورت میں بڑی تعداد میں دبے اور کچلے لوگوں کو ہم اسلام کی طرف راغب کر سکتے ہیں۔

۴- حصول علم سے بے اعتنائی:

اسلام حصول علم کا داعی اور نقیب ہے کیونکہ علم سے ہی انسان کی شخصیت سنورتی ہے اور تعمیر جہاں کی صلاحیت اس کے اندر پیدا ہوتی ہے علم روشنی اور جہالت تاریکی ہے۔ اسلام میں حصول علم پر جتنا زور ہے اس کی مثال دیگر مذاہب میں نہیں مل سکتی۔ علم پروری اور فروغ علم کی ہمہ جہتی کوشش مسلم معاشرہ کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اور جب تک یہ خصوصیت باقی رہی، ہم نے اس میدان میں دنیا کی امامت کی اور کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ آج ان ذروں کو بھی ندرتی تابانی پہ ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں علم کا شوق ناپید ہے تعلیم کی عظمت کو ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ اس حالت کے مختلف اسباب ہیں۔ آزادی کے بعد جس طرح ہمارے ساتھ امتیازی سلوک برتا گیا اور ملازمتوں میں جو متعصبانہ رویہ اپنایا

گیا وہ بھی ایک اہم عامل ہے۔ بیرون ملک حصول معاش کی ہوڑ نے بھی تعلیم سے ہمارے نوجوانوں کو دور کیا ہے حالانکہ مشاہدہ و تجربہ یہ بتاتا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ہی ہر جگہ کامیاب ہوتا ہے۔ آج اپنی تعلیمی شناخت کی بازیافت ہمارے معاشرے کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔

۵- فضول خرچی:

اسلام ہر چیز میں میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے مال کمانے اور مال خرچ کرنے کے سلسلے میں اس کی ہدایت بہت واضح ہیں اسراف، فضول خرچی اور نام و نمود کے لئے مال کے استعمال کو سختی سے منع کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں ایسا کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ مسلم سماج میں یہ بیماری پیدا ہو گئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا ہے وہ نام و نمود کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور شادی بیاہ، دیگر تقریبات اور دکھاوے کے کاموں میں پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہیں۔ ہمارے سماج میں اگر اس برائی پر کنٹرول ہو اور سماجی و رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کا جذبہ پروان چڑھے تو ملت کی ترقی اور انسانیت کی خدمت کا بڑا کام ہو سکتا ہے۔ سماج میں دبے کچلے لوگوں کو اوپر اٹھانے میں مدد ملے گی جس سماج میں خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہو وہاں فضول خرچی کس طرح گوارا کی جا سکتی ہے۔

۶- سیاسی بے شعوری:

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں واضح تعلیمات دیتا ہے سیاست دین کا ایک اہم شعبہ ہے عدل و انصاف کا قیام دین کے اہم ترین مقاصد میں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط"۔ رسول اکرمؐ نے عادلانہ حکومت کی بہترین مثال قائم کی ہے اور خلفاء راشدین نے آپؐ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فلاحی مملکت کی عملی تصویر پیش کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں ایسا وقت بھی آیا کہ زکوٰۃ لینے والے کمیاب ہو گئے اور ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ ہمارے سماج میں آج کتاب و سنت کی بنیاد پر اسلامی سیاست کی اہمیت و ضرورت کا تصور ناپید ہو گیا ہے عام طور سے لوگ سیاست کو دین سے خارج سمجھتے ہیں اور نام نہاد دانشور جو سیاسی میدان میں قوم کی رہنمائی کا دم بھرتے ہیں وہ اسلام کی سیاسی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ پوری قوم کو لادینی سیاست کے دلدل میں پھنسا دیا گیا ہے، جن کے پاس روشنی کا خزانہ ہے وہ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں مسلمانوں کے اندر یہ شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ عدل و انصاف کے علمبردار بن کر انہیں انسانوں کو ان کا حق دلانے کی جدوجہد کریں اور ایمانداری کے ساتھ سیاسی میدان میں عوام کی خدمت

کی مثال قائم کریں۔ سیاست خدمت انسانیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ سماج کے پس ماندہ مظلوم طبقات کو انصاف دلانا بڑی اہم دینی ذمہ داری ہے۔ اس شعور کو بیدار کرنے اور پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ مسلمان قیادت وسیادت کے لئے برپا کی گئی امت کا نام ہے۔

زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو
اس زمیں کی پستیوں میں آسماں بن کر رہو

☆☆☆

اسوۂ رسولؐ ہی سب کچھ ہے

''آدمی اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے''۔ جس نے بھی یہ کہا سچ کہا ہے۔ بُرے آدمی کے بھلے ساتھی ہوا نہیں کرتے۔ رسول اللہؐ کے صحابہؓ کی زندگیاں آپؐ کی راست بازی اور دائمی حق وصداقت ہونے کی سب سے بڑی دلیل نہیں، دلیلیں ہیں۔ ان میں کا ہر فرد اپنی جگہ آسمان ہدایت کا روشن ستارہ اور انسانی معاشرے کا گوہر شب چراغ تھا۔ انبیاء کے بعد اس بلند سیرت وکردار کے انسان دنیا میں پیدا نہیں ہوئے۔ سیاست ومعاشرت کے چہرے کو انھوں نے دھویا، تہذیب وتمدن کی زلفوں کو انھوں نے سنوارا۔ خدا ترسی اور انسان دوستی کی مثالیں ان نیک انسانوں نے قائم کیں اور نیکی کی بنیاد اور کتاب وسنت کی اساس پر اپنے دور کی سب سے بڑی حکومت کو چلا کر انھوں نے دکھا دیا۔

دنیا اگر فوز وفلاح اور سکون واطمینان چاہتی ہے تو اسے چاہئے کہ رسول اللہؐ کی مقدس تعلیمات کے مطابق اپنے کو بدل لے، چاہے اس تبدیلی میں معاشرے کی ایک ایک اینٹ کیوں نہ اکھیڑنی پڑے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ تمدن وتہذیب اور معاشرے کی غلط کاریوں سے نباہ کرنے کے لیے رسول اللہؐ کے حکم میں ایک شوشے کی بھی تبدیلی گوارا کرلی جائے۔ زندگی اور ترقی نام ہی اسوۂ حسنہ کے اتباع کا ہے۔ جہاں یہ اتباع نہیں وہاں رجعت ہے، زوال ہے، موت ہے!

دنیا جن پر آشوب حالات سے گزر رہی ہے اس کے لیے انقلاب ناگزیر ہے۔ دنیا میں انقلاب آکر رہے گا مگر دیکھنا یہ ہے کہ انقلاب کس راہ سے آتا ہے۔ نیکی کی راہ سے یا برائی کی راہ سے۔ ہم جو ''خیر امم'' کہلاتے ہیں ہماری یہ ذمے داری ہے کہ انقلاب کی زمام کار ہمارے ساتھ میں ہو اور تمام دنیا کو ہم خیر وسعادت سے معمور کردیں، یہاں تک کہ اسوۂ رسولؐ کے سایۂ دامن میں سے کوئی زندگی اور خطۂ ارض باہر نہ رہے۔

(ماہر القادری)

رپورٹ انجمن طلبۂ قدیم بموقع آٹھواں اجلاس عام

تاریخ: ۳۰، ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز جمعہ، سنیچر مطابق ۱۰، ۱۱/ ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ

مقام: جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی

ترتیب وپیش کش: ڈاکٹر عبدالباری فلاحی، سکریٹری، انجمن طلبۂ قدیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْن۔ اَمَّابَعْد

مہمانان عظام، اساتذۂ کرام اور محترم فلاحی برادران

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گردش لیل ونہار اور انقلاب ماہ وسال کی حقیقت اور اہمیت سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے۔ روز مرہ کی زندگی میں اس کا استعمال بکثرت ہوتا ہے لیکن جب کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا ہے یا کوئی اہم پروگرام منعقد ہوتا ہے تو وہ تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ بن جاتا ہے۔ میری مراد ۱۴/ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے ہے۔ یہی وہ تاریخ ہے جب چند فارغین جامعہ اور دانشوران ملت نے انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی داغ بیل ڈالی تھی۔

قیام انجمن کے بعد سے اب تک تقریباً ۳۲ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران مختلف صدور انجمن اور نظماء اجلاس کی صدارت اور نگرانی میں سات اجلاس عام سرزمین جامعۃ الفلاح پر منعقد ہوئے جن کا اس موقع پر ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

پہلا کنونشن: ۷، ۸/ مارچ ۱۹۸۰ء	بروز جمعہ، سنیچر بمقام جامعۃ الفلاح
دوسرا کنونشن: ۲۱/۲۲/۲۳/ نومبر ۱۹۸۲ء	بروز اتوار، سوموار، منگل بمقام جامعۃ الفلاح
تیسرا اجلاس: ۱۸/۱۹/۲۰/ فروری ۱۹۸۵ء	بروز سوموار، منگل، بدھ، بمقام جامعۃ الفلاح
چوتھا اجلاس: ۱۲/۱۳/ فروری ۱۹۸۸ء	بروز سنیچر، اتوار، بمقام جامعۃ الفلاح
پانچواں اجلاس: ۲۸/۲۹/۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۲ء	بروز بدھ، جمعرات، جمعہ، بمقام جامعۃ الفلاح
چھٹا اجلاس: ۲۴ تا ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۶ء	بروز جمعرات، جمعہ، سنیچر، اتوار، بمقام جامعۃ الفلاح
ساتواں اجلاس: ۱۵/۱۶/۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۹ء	بروز جمعہ، سنیچر، بمقام جامعۃ الفلاح

جن بھائیوں نے ان اجلاسوں میں شرکت کی ہوگی ان کو یقیناً اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا اور پروگرام کے اختتام کے بعد اس خواہش اور عہد کے ساتھ اپنے مقامات پر گئے ہوں گے کہ آئندہ جلد ہی نئے عزم و حوصلے کے ساتھ شریک اجلاس ہوں گے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ہمارے بعض احباب ایسے بھی ہیں جن کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور وہ ایسی جگہ چلے گئے جہاں سے اب لوٹنا ممکن نہیں۔ بعض احباب ایسے بھی ہیں جو بہت حد تک مایوس ہو چکے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ شاید اب جامعۃ الفلاح کی سرزمین پر اجتماعی شیرازہ بندی کی وہ شکل دیکھنے کو نہ ملے گی جو ماضی بعید میں دیکھنے کو ملی تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ آج وہ دور دور ہو گیا، ملاقات کی جو اضطرابی کیفیت تھی، آج کا یہ منظر دیکھ کر ختم ہوئی۔ شک و شبہات کے جو تاریک بادل منڈلا رہے تھے وہ آج بررحمت بن کر دل و دماغ کو سکون بہم پہنچا رہے ہیں۔ ۱۱ سال کے طویل وقفہ کے بعد آج سرزمین جامعۃ الفلاح پر مجتمع ہونا ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ ذمہ داران انجمن نے گرچہ یہ فیصلہ ایک سال قبل ہی لے لیا تھا لیکن اجتماع عام کی کوئی خاص امید نظر نہیں آ رہی تھی، وجہ سب پر عیاں ہے یعنی رابطہ کا منقطع ہو جانا، شکوک و شبہات کا پیدا ہونا اور مختلف النوع فاصلوں کا جنم لینا۔ آج ہماری یکجائی کا سبب خلوص و محبت، اخوت و یگانگت کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے ہم سب کو ایک خیمے تلے جمع کیا ہے۔

محترم بھائیو! یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بھی کسی ادارہ، جماعت، سوسائٹی، تنظیم یا انجمن کی تشکیل عمل میں آتی ہے تو اس کے پیچھے کچھ اغراض و مقاصد ہوتے ہیں اور اس کا انحصار ان افراد کے افکار اور خیالات پر ہوتا ہے جو اس سے منسلک ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر و احسان ہے کہ جب ہماری انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا تو اس کے جو اغراض و مقاصد طے کیے گئے وہ اس وقت کے افراد کی وسعت قلبی، فکر و خیال کی بلندی، ذہن و دماغ کی رفعت، ملک و ملت کے جذبۂ خدمت اور للّٰہیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اغراض و مقاصد اتنے جامع اور مستحکم ہیں کہ حالات کی تبدیلی اور اقتدار کی منتقلی کے باوجود بھی ان پر کوئی حرف نہیں آیا۔ اس موقع پر ہمیں مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کی یاد آتی ہے جنھوں نے اپنی بصیرت اور دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر ثبت کرنے اور دستور کا جزء بنانے کی ہدایت دی تھی۔

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے قبل اغراض و مقاصد کو ذہنوں میں تازہ کر لیا جائے۔

جامعۃ الفلاح کو جن اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر قائم کیا گیا انھیں مقاصد کے حصول کے لیے فارغین جامعہ کو منظم کرنا، ان کی صلاحیتوں کو ان مقاصد کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید اور موثر بنانے کی

تدابیر اختیار کرنا، ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنا، نیز جامعہ کی تعمیر و ترقی میں ذمہ داران جامعہ کے ساتھ تعاون کرنا اور مقاصد جامعہ کے حصول کے لیے دیگر دینی اور تعلیمی اداروں سے ربط رکھنا اور ان کا تعاون حاصل کرنا ...... یہ ہیں وہ اغراض و مقاصد جن کے حصول کے لیے انجمن کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔

۱. رکنیت:

فارغین جامعہ کی جو فہرست مرتب کی گئی ہے اس کے مطابق ۲۰۰۹ء تک ان کی تعداد ۲۰۵۱ ہے۔ اس سے آپ طلبہ کی مزید حصول علم کی دلچسپی اور عدم دلچسپی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۱۹۶۷ء سے فراغت کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ہنوز جاری ہے۔ بیالیس سال کے اس طویل عرصہ میں جامعۃ الفلاح کے فارغین دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن اب تک ان تمام بھائیوں سے جہد مسلسل کے باوجود ربط قائم نہ ہو سکا۔ اس کی اصل وجہ ان کے جائے قیام کی عدم دستیابی ہے اور کسی بھی فرد واحد کے لیے اس کا پتہ لگانا بہت ہی مشکل بلکہ دوسروں لفظوں میں ناممکن ہے۔ اخبارات میں اعلان کے باوجود بہت سے فلاحی بھائیوں کے پتے نہیں مل سکے، تاہم مختلف ذرائع سے ربط قائم کرنے اور ان کو کاروان انجمن میں شامل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اب تک چھ سو احباب انجمن کے باقاعدہ ممبر بن چکے ہیں اور اس تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمیں ان سے مستقبل میں کافی توقعات وابستہ ہیں۔

مایوس نہ ہو ، ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

۲. رابطہ:

فلاحی برادران سے ربط قائم کرنا اور ان کے حالات و کوائف سے آگہی حاصل کرنا انجمن کے ذمہ داروں کا اہم فریضہ ہے۔ اس کے لیے خط و کتابت، موبائل، ای میل، اور خبرنامہ جیسے اہم ذرائع استعمال کیے گئے۔ لیکن ان تمام جدید سہولتوں کے باوجود مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہم اس میں ابھی تک مکمل طور سے کامیابی نہیں حاصل کر سکے ہیں۔ اگر ایک طرف فلاحیوں کے پتے دریافت ہوتے ہیں تو دوسری طرف چند افراد کی جائے سکونت اور رابطے نمبر بدل چکے ہوتے ہیں۔ تاروں کے انسلاک اور عدم انسلاک کا ایک سلسلہ ہے۔ میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ذمہ داران انجمن نے اس کے لیے حتی الوسع کوششیں کیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ہند و بیرون ہند فلاحی برادران کی خیریت دریافت کرنے اور ان سے انجمن کے فروغ میں بہت حد تک مدد ملی۔

آپ سوچ سکتے ہیں کہ ۱۹۹۹ء کے بعد انجمن میں جو شگاف پڑ گیا تھا اور اس کے نتیجہ میں جو جمود و تعطل قائم ہو گیا تھا اور عدم تعاون کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی اس کو ۲۴ ماہ کے قلیل عرصہ میں کیسے دور کیا جا سکتا ہے اور منتشر کڑیوں کو کیسے جوڑا جا سکتا ہے۔ کسی بھی مدرسہ کے ابنائے قدیم کو باہم مربوط رکھنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ لوگ اپنی تقریروں میں بیان کرتے ہیں۔ یہ مرحلہ آسان ہو سکتا ہے اگر ہر فلاحی بھائی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنے احوال و کوائف سے آگاہ کرتا رہے۔ ذمہ داری کو صرف ذمہ داران انجمن تک محدود کرنے کے بجائے اس کا اطلاق ہر شخص پر کیا جائے۔ اشتراک و تعاون کا جذبہ جب تک ہر شخص کے رگ و ریشہ میں سرایت نہ کر جائے اس وقت تک ہدف مقصود کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ یونٹس کا قیام

دستور انجمن کی دفعہ ۱۵ کے مطابق ذمہ داران کا ایک کام مرکز کے ماتحت ذیلی یونٹوں کا قیام بھی ہے۔ فی الحال ان مقامات پر یونٹس قائم کی گئی ہیں، جہاں فارغین جامعہ قابل لحاظ تعداد میں ہیں۔

دہلی یونٹ: اس کے کوآرڈی نیٹر فی الحال انجمن کے خازن جناب مشرف حسین صدیقی صاحب ہیں۔ چونکہ فلاحی حضرات دہلی کے مختلف علاقوں میں سکونت پذیر ہیں، اس لیے مختلف حلقہ جات قائم کر دیے گئے ہیں اور ان کے ذمہ دار مقرر کر دیے گئے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دو سو سے زائد فلاحی دہلی میں مقیم ہیں، مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں، اب تک کئی نشستیں منعقد ہو چکی ہیں۔ رمضان المبارک کے موقع پر اجتماعی افطار و طعام کا اہتمام کیا گیا، جس میں کثیر تعداد میں فلاحی برادران نے شرکت کی۔

ممبئی یونٹ: ممبئی کی اہمیت اس اعتبار سے زیادہ ہے کہ یہاں زیادہ فلاحی حضرات مختلف النوع کاروبار سے وابستہ ہیں۔ یہاں کوئی ایسی یونیورسٹی نہیں ہے جس کا الحاق جامعۃ الفلاح سے ہو، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے طلبہ کی تعداد بہت ہے جو سند عالمیت/فضیلت حاصل کرنے کے بعد مزید حصول علم کے لیے یہاں مقیم ہوں۔ افسوس کہ ابھی تک صحیح تعداد کا علم نہیں ہو سکا لیکن سینئر فلاحیوں سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ کم و بیش دو سو برادران ممبئی میں مقیم ہیں۔ اس یونٹ کے ذمہ دار برادر محمد خالد مخدومی ہیں۔

بھیونڈی یونٹ: یہ شہر بھی کچھ بھائیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہاں کے ذمہ دار برادر عنایت اللہ فلاحی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ۳۵ فلاحی یو تو تدریس سے وابستہ ہیں یا پھر کسی کاروبار سے۔ یہاں پر بیشتر فرزندوں نے انجمن کا فارم پر کر دیا ہے اور وہ مختلف پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔

علی گڑھ یونٹ: خاکسار کی موجودگی میں ۲۰۰۹ء کے اوائل میں ایک نشست ہوئی جس میں شرکاء کو انجمن کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا گیا اور ان کے مشورہ سے ڈاکٹر محی الدین ساجد فلاحی کو کوآرڈی نیٹر منتخب کیا گیا، طلبہ کے اصرار پر ایک ماہ کے وقفہ سے دوسری میٹنگ ہوئی جس میں صدر انجمن، سکریٹری، اور معاون سکریٹری شریک ہوئے۔

کانپور یونٹ: ایک رپورٹ کے مطابق یہاں ۱۵ فلاحی ہیں، اس یونٹ کے ذمہ جناب ڈاکٹر افتخار احمد صاحب ہیں۔ میں اپنے ذاتی کام سے دو بار وہاں گیا اور میٹنگ میں شرکت کا موقع ملا۔

بلریا گنج یونٹ: بلریا گنج کے مقامی یونٹ کا انتخاب ۲۳ مئی ۲۰۰۹ء کو عمل میں آیا جس میں اتفاق رائے سے برادر معین الدین فلاحی کو صدر، برادر محمد آصف فلاحی کو سکریٹری اور برادر ابو حمزہ کو خازن مقرر کیا گیا۔

ڈومریا گنج یونٹ: ضلع سدھارتھ نگر میں ڈومریا گنج کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے اردگرد بہت سے فلاحی برادر مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان لوگوں کے مشورے سے یونٹ بنانے کا فیصلہ کیا گیا، فی الحال اس کے ذمہ دار برادر جمیل احمد فلاحی ہیں۔

قطر یونٹ: فی الحال اس کے ذمہ دار جناب محمد اکرم صاحب ہیں جو مجلس شوریٰ اور نمائندگان دونوں کے رکن ہیں۔ وقتاً فوقتاً میٹنگ ہوتی رہتی ہے، بیشتر بھائیوں نے فارم رکنیت پُر کر دیا ہے اور وہ انجمن کو فعال بنانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں، ان کے مالی تعاون سے کاروانِ انجمن کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ملی ہے۔

ریاض یونٹ: اس وقت ریاض (سعودی عرب) میں ۵۰ سے زائد فلاحی برادران مقیم ہیں۔ اس یونٹ کے ذمہ دار برادر شکیل احمد فلاحی ہیں۔ انھوں نے تمام احباب سے رابطہ قائم کرنے اور ان کو ایک جگہ جمع کرنے کی بہت کوششیں کی ہیں، اللہ ان کو مزید توفیق عطا فرمائے۔

لندن یونٹ: اس کے ذمہ دار جناب غلام نبی فلاحی صاحب ہیں، وہ انجمن کے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں۔ لیکن اب تک وہ فعالیت نہیں آئی جس کی توقع کی جا رہی تھی۔

۴۔ نشستوں کا انعقاد:

دستور انجمن کے مطابق ایک مجلس نمائندگان اور دوسری مجلس شوریٰ ہے۔ اب تک نمائندگان کی دو نشستیں منعقد ہو چکی ہیں ایک دسمبر ۲۰۰۸ء میں جامعۃ الفلاح میں اور دوسری ۲۲ فروری ۲۰۰۹ء کو دہلی میں۔ اسی طرح مجلس شوریٰ کی بھی دو نشستیں ہو چکی ہیں اور دونوں ہی جامعۃ الفلاح میں بالترتیب دسمبر ۲۰۰۷ء اور دسمبر ۲۰۰۸ء۔ علاوہ ازیں مختلف مسائل پر غور و خوض کے لیے ذمہ داران انجمن کی کئی نشستیں دہلی میں منعقد ہو چکی ہیں۔

۵.آفس کا قیام:

کسی بھی نظم کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے آفس کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر مربوط اور منظم انداز میں کام کرنے میں بہت سی مشکلیں درپیش آتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ جامعۃ الفلاح اور دہلی دونوں مقامات پر کام ہو رہا ہے۔ دہلی آفس کا پتہ:

ATQ, 3 &4, 387, Lane No. 17, Zakir Nagar, Okhla.
New Delhi-110025

۶.تقسیم انعامات:

ہمارے منصوبے میں روز اول سے ہی یہ بات شامل تھی کہ جامعۃ الفلاح میں زیر تعلیم بچوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر ہر سال اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو انعامات تقسیم کیے جائیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس میں ہمیں کامیابی ملی اور ۲۰ دسمبر ۲۰۰۹ء میں صبح دس بجے مولانا ابواللیث ہال میں ایک جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا جس میں ذمہ داران انجمن کے علاوہ جامعۃ الفلاح کے اساتذہ کرام اور طلبہ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر ۵۵ طلبہ کو انعامات سے نوازا گیا۔ انعام یافتگان کی فہرست خبرنامہ میں شائع ہو چکی ہے۔

۷.خبرنامہ کا اجراء:

یہ بات سب کے علم میں ہے کہ انجمن کی جانب سے ایک ماہانہ مجلہ حیات نو کے نام سے شائع ہوتا تھا لیکن وہ بعض وجوہ کی بنا پر بند ہو گیا۔ گزشتہ سال مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ خلا کو پر کرنے کے لیے فوری طور سے خبرنامہ کا اجراء کیا جائے تاکہ جامعہ کے شب و روز اور فلاحی برادران کے حالات اور انجمن کی کارکردگی کے بارے میں واقفیت ہوتی رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس میں بھی کامیابی ملی اور اب تک دو شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

۸.ویب سائٹ:

بہت دنوں سے یہ آواز اٹھتی رہی کہ فارغین جامعہ کی ایک ویب سائٹ تیار کی جائے لیکن کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ گزشتہ سال بعض ماہرین فن سے گفتگو بھی ہوئی، کامیابی نہیں ملی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کو کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو کوئی نہ کوئی شکل فراہم ہو جاتی ہے۔ ابھی چند روز پہلے چند احباب کے توسط سے اس مسئلہ کو حل کرنے میں مدد ملی ہے۔ اس کا Layouts تیار ہو چکا ہے، توقع ہے کہ دو ماہ میں اس کا اجراء عمل میں آجائے گا۔

۹.فارغین جامعہ کی فہرست:

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ۱۹۶۶ء سے ۲۰۰۸ء تک ۲۰۵۱ طلبہ جامعۃ الفلاح سے فارغ ہو چکے ہیں لیکن اب تک کوئی مربوط اور جامع لسٹ منظر عام پر نہیں آئی۔ کئی سال قبل جامعۃ الفلاح سے ایک ڈائرکٹری شائع ہوئی جس میں سن کے اعتبار سے عالمیت اور فضیلت پاس شدہ طلبہ کی الگ الگ فہرست موجود ہے لیکن وہ مستقل اور عارضی پتے سے خالی۔ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ اجلاس عام کے موقع پر اس طرح کی فہرست شائع کی جائے چنانچہ ایک فہرست تیار کی گئی جس میں سن فراغت کے اعتبار سے طلبہ کے نام اور ان کے حاصل شدہ پتے ہیں۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک عکسی کاپی موجود ہے آپ اس میں حسب ضرورت حذف و اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر میں مولانا رحمت اللہ صاحب کا مشکور ہوں کہ انھوں نے کچھ تفصیلات فراہم کرنے میں ہماری مدد کی۔

۱۰.فہرست ممبران انجمن:

فارغین جامعہ میں سے جن احباب نے فارم رکنیت پُر کیا ہے ان کی ایک فہرست نہ صرف یہ کہ آپ کی خدمت میں پیش ہے بلکہ بذریعہ انٹرنیٹ ان فلاحی بھائیوں تک منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کے ای میل ایڈریس ہمارے پاس موجود ہیں لیکن ان میں رد و بدل اور اصلاح کی ضرورت ہے۔

برادران محترم! ہمیں یہ بات بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ اجلاس جس میں ہم شرکت کی غرض سے دور دراز کا سفر کر کے آئے ہیں، ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے مقام کو سمجھیں اور سنجیدگی و دیانتداری کے ساتھ یہ جائزہ لیں کہ انجمن کے فروغ اور تعمیر و ترقی میں ہم نے کتنا حصہ لیا؟ اور انجمن کے قیام کے جو اغراض و مقاصد ہیں ان کے حصول کے لیے ہم نے کتنی کوششیں کیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مربوط اور منظم انداز میں کام کریں اور اپنی سرگرمیوں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھیں وقت کی قدر و قیمت کو پہچانیں۔ تیز رفتار بدلتے ہوئے حالات کو مد نظر رکھیں اور "یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد" کا مفہوم مستحضر رکھیں، اخوت و محبت کا ماحول پیدا کریں، نفرت اور عداوت کو ختم کریں۔ اور "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" کا فرمان رسول ذہن و دماغ میں ہر وقت تازہ رکھیں۔

معزز حضرات! اجتماعی راہ بہت ہی دشوار گزار راہ ہے، مسائل اور دشواریوں سے پر ہے، لیکن اللہ کا بے پایاں شکر ہے کہ اس نے ہمیں ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے قابل تعریف رفقاء عطا کیے۔ ہر مشکل گھڑی میں نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنا قیمتی وقت اور مشورے دیے بلکہ بوقت ضرورت مالی تعاون بھی پیش کیا۔ اس موقع پر اگر اساتذہ کرام، بہی خواہان جامعہ اور ہمدردان طریق و اطراف و مضافات کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بڑی ناسپاسی ہوگی۔ انھوں نے ہمیں ہر قسم کا تعاون مرحمت فرمایا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں سے درگزر فرمائے اور نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ انجمن کو فعال اور مستحکم بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگی میں ہیں یہ مردوں کی زنجیریں

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا بات بنے

☆☆☆

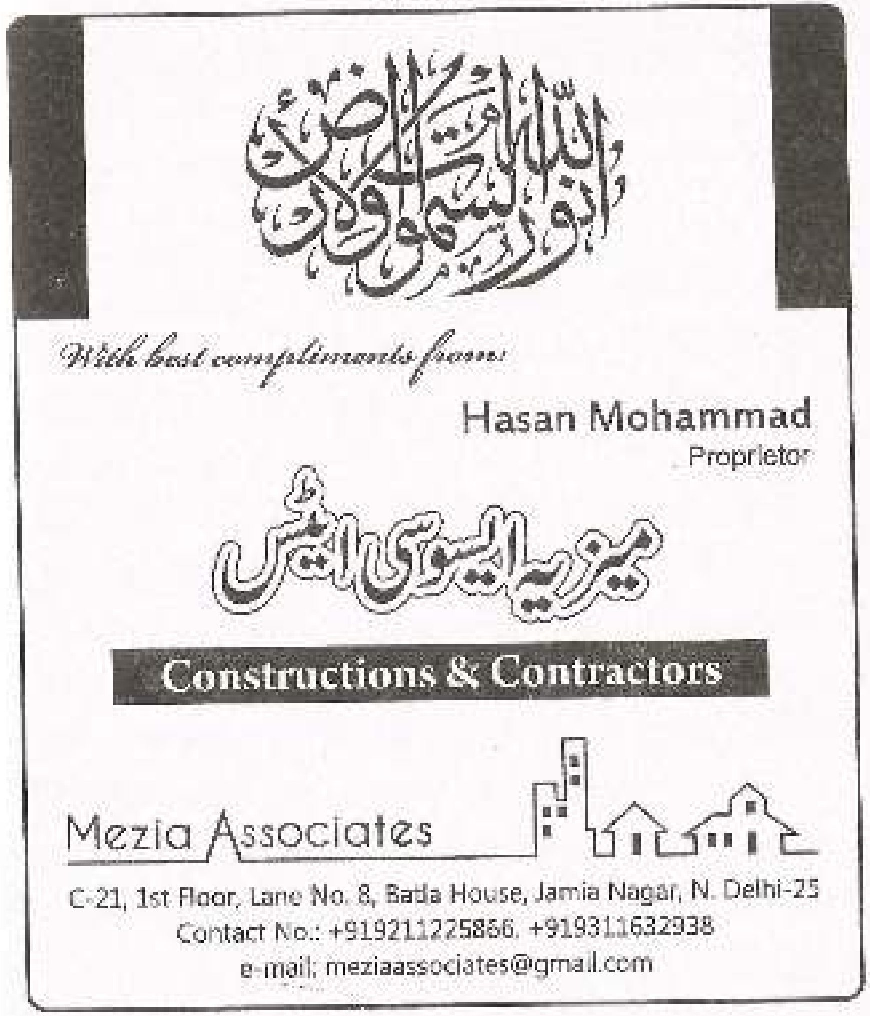

مختصر رپورٹ آٹھواں اجلاسِ عام و سمینار

منعقدہ ۳۰/۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

ترتیب: ڈاکٹر عبدالباری فلاحی
(سکریٹری انجمن طلبہ قدیم)

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا اجلاس عام مقررہ تاریخ اور وقت پر شروع ہوا۔ ماہ اکتوبر کی ۳۰ تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا، ہر شخص نماز جمعہ کی تیاری میں مصروف تھا کہ اذان جمعہ سے ایک گھنٹہ پہلے فلاحی برادران کا ایک جھنڈ امڈ آیا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طلباء اور دیگر نمائندگان پر مشتمل تھا۔ اس سے پہلے ۲۹/ اکتوبر کو بھی مختلف صوبہ جات سے فلاحی برادران جامعۃ الفلاح کی سرزمین پر تشریف لا چکے تھے۔ اعظم گڑھ اور اس کے اکناف و اطراف کے فلاحی برادران مہمان ہونے کے باوجود میزبانی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ایک وقت میں تقریباً ۴۰۰ فارغین جامعہ کا اجتماع اتحاد و اتفاق کا دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔

نماز جمعہ کے بعد ابواللیث ہال میں ٹھیک 2:30 بجے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا۔ نظامت کی ذمہ داری برادر عبدالرحمن زریاب فلاحی نے انجام دی۔ عبدالرقیب فلاحی کی تلاوت قرآن کے بعد عزیزم معظم علی (ساکن اروایا، نگر، بدایوں) کی حادثاتی موت پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی جس میں انہیں شہید قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ریحان احمد فلاحی کے ساتھ طلبۂ جامعۃ الفلاح نے دلکش انداز میں ترانۂ جامعہ پیش کیا۔ برادر زبیر ملک فلاحی (معاون ناظم اجلاس) نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام شرکائے اجلاس کا تہہ دل سے خیر مقدم اور استقبال کیا۔ اس کے بعد سکریٹری انجمن ڈاکٹر عبدالباری فلاحی نے انجمن کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ پھر صدر انجمن ڈاکٹر ملک محمد فیصل کے خطبۂ صدارت کے بعد 1:00PM پر مجلس کا اختتام ہوا۔

دوسرا سیشن 5:45PM پر شروع ہوا جو ممبران انجمن کے باہمی تعارف پر مشتمل تھا۔ اس کی صدارت مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی اور مولانا ظہیر عالم فلاحی فرما رہے تھے۔ برادر اظہر الدین فلاحی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے چھوٹے بڑے بلا امتیاز تمام فلاحی برادران نے نہایت خندہ دلی کے ساتھ اپنا اپنا تعارف پیش کیا۔ اس پروگرام میں تقریباً چھ سو فارغین موجود تھے۔

فارغین فلاح کے مختصر باہمی تعارف کے فوراً بعد ''ہم اور ہماری انجمن'' کے عنوان پر ایک طویل مذاکرہ ہوا جس میں ۱۹ معتبر و باوقار فلاحی برادران نے حصہ لیا۔ آخر میں زادِ راہ اور دعا کے ساتھ یہ پروگرام اختتام کو پہنچا۔

دس بجے شب میں جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کا تعلیمی مظاہرہ شروع ہوا جس میں معتمدین جمعیۃ الطلبہ کی قیادت میں کئی متعلمین جامعہ نے تقریر و تحریر اور ڈرامہ کے ذریعہ اپنی بیش بہا صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ سکریٹری جمعیۃ نے معتمدین جمعیۃ کی مختلف شعبوں کی ذمہ داریوں کو شرکاء کے سامنے آشکار کیا۔ جمعیۃ الطلبہ کی ضروریات اور ان کے حصول کے ذرائع کا اعلان کیا۔ بالآخر گیارہ بجے شب یہ سیشن ختم ہوا۔ اس پروگرام میں طلبا اور دیگر حضرات کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔

۱۳/ اکتوبر بروز سنیچر دو پروگرام منعقد ہوئے جن میں سے ایک سیمینار اور دوسرا خطاب عام کے لیے مختص تھا۔ سیمینار کا مرکزی موضوع تھا ''مسلمانانِ ہند کی شیرازہ بندی میں علماء کا کردار''۔ یہ سیمینار تین سیشن پر مشتمل تھا۔

پہلے سیشن کا عنوان ''فکری و مسلکی شیرازہ بندی'' تھا جو 8:00 بجے صبح امیر شریعت بہار و اڑیسہ مولانا سید نظام الدین صاحب کی زیر صدارت شروع ہوا۔ کنوینر کا فریضہ برادر شمشاد حسین فلاحی نے انجام دیا۔ برادر عبدالحمید حاکم کی تلاوت قرآن مجید سے اس مجلس کا باوقار آغاز ہوا۔ پروفیسر پی کے عبدالعزیز (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) یونیورسٹی میں ناگہانی حادثہ کے سبب اس سیشن میں شریک نہیں ہوسکے۔ اس لیے افتتاحی خطاب مولانا نظام الدین اصلاحی (استاذ جامعہ) نے فرمایا۔ کلیدی خطبہ ناظم اجلاس مولانا مقبول احمد فلاحی نے پیش کیا۔

اس کے بعد مختلف موضوعات پر مقالات پیش کیے گئے جن میں شریک مقالہ نگار جناب مولانا ولی اللہ مجید قاسمی نے ''اسلام کے فکری مناہج کا جائزہ اور موجودہ مسلم معاشرہ پر ان کے اثرات'' پر جناب شیخ رضاء اللہ عبدالکریم سلفی نے ''فقہی مسالک کی حقیقت اور موجودہ حالات میں امت پر ان کے مثبت و منفی اثرات کا جائزہ'' کے موضوع پر اور جناب مولانا عطاء الرحمٰن وجدی نے ''اتحاد کی بنیادیں، موانع و مشکلات اور آئندہ کا لائحہ عمل پر'' اپنا مقالہ پیش کیا۔ آخر میں جناب مولانا سید نظام الدین نے صدارتی تقریر کی، جس میں آپ نے فرمایا کہ کچھ ایسی مشترک بنیادیں ہیں جن کا تعلق ہمارے تشخص اور ہماری بقا سے ہے ان پر ہم سب کو مجتمع ہونا چاہیے۔ یہ سیشن 10:30AM پر ختم ہوگیا۔

اب وقت تھا سیمینار کے دوسرے سیشن کا، جو سیاسی شیرازہ بندی سے متعلق تھا۔ شرکاء کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوا اور جناب ایس۔ ایم۔ اے کاظمی صاحب (چیئرمین اقلیتی کمیشن اتر پردیش) کی

صدارت میں گیارہ بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ کنوینر برادر حسن حبیب فلاحی نے جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب کو افتتاحی کلمات کے لیے مدعو کیا۔ مولانا موصوف کے پُر مغز کلمات کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مجلس میں شریک تمام مقالہ نگاران نے اپنی فنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا جس سے شرکاء کے سامنے مرکزی موضوع کے تمام پہلو واضح طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ جناب ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس نے ''تکثیری معاشرہ میں مسلم اقلیت کی سیاست کے خدوخال'' پر گفتگو کی۔ بعد ازاں جناب ڈاکٹر حسن رضا نے آزادی کے بعد مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ان کے حل کی کوششوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں فروعی اور ناقابل اعتنا چھوٹے مسائل کے بجائے عام انسانی مسائل کو بنیاد بنا کر کام کرنا چاہیے اور اپنی سیاسی قیادت کو ابتداء سے تیار کرنا چاہیے۔ اس کے بعد جناب مولانا سلطان احمد اصلاحی نے علماء کی موجودہ سیاسی قیادت پر گفتگو کی۔ جناب پروفیسر منظور احمد نے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں مسلم سیاست کے کردار پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمان عدل و انصاف قائم کرنے اور غرباء اور مفلوک الحال لوگوں کی مدد کے لیے برپا کیے گئے ہیں، ان کو الگ سیاسی پارٹی قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میں جناب ایس۔ ایم۔ اے کاظمی نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ہمیں احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری پوزیشن اتنی کمزور نہیں ہے جتنا کہ تقریروں میں بیان کیا جارہا ہے۔

تیسرا اور آخری سیشن دوپہر بعد 2:30 بجے شروع ہوا اس کا عنوان ''معاشرتی و دینی شیرازہ بندی'' تھا۔ اس کی صدارت جناب مولانا سید جلال الدین عمری صاحب (امیر جماعت اسلامی ہند) نے فرمائی اور برادر ابوالکلام فلاحی نے کنوینر کے فرائض انجام دیے۔ جناب مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کے افتتاحی کلمات کے بعد مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ ناظم جامعۃ الفلاح جناب مولانا طاہر مدنی نے ''مسلم معاشرہ کے مسائل اور ان کے اسباب کا ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا اور ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی نے ''مسلم معاشرہ میں طبقاتی امتیازات ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اختتام سیشن پر مولانا جلال الدین انصر عمری نے فرمایا کہ ہمارے اندر سے خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس ختم ہوگیا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ میں فساد پیدا ہوگیا ہے۔

اختتام سیمینار کے بعد قرارداد پیش کی گئی جس میں داخلی استحکام، علماء کے مقام، ملت کی شیرازہ بندی اور دینی مدارس سے متعلق اہم امور شامل تھے۔

اجلاس عام اب اپنے آخری مرحلہ میں داخل ہوچکا تھا۔ صرف ایک پروگرام ''خطاب عام'' باقی

تھا۔ قرب وجوار سے آئے ہوئے سیکڑوں کی تعداد میں مرد و زن اور فلاحی برادران کی شمولیت اتحاد و اتفاق اور اخوت کا منظر پیش کر رہی تھی۔ بعد نماز عشاء "واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً ولا تفرقوا" کے عنوان پر جناب پروفیسر پی۔ کے عبد العزیز کے عدم شرکت کی وجہ سے مولانا سید نظام الدین صاحب کے زیر صدارت خطاب عام کا پروگرام شروع ہوا۔ اس موقع پر جامعۃ الفلاح کی ویب سائٹ کا اجراء عمل میں آیا اور اس کا ایک منظر بھی پیش کیا گیا۔ مولانا موصوف کے علاوہ جن لوگوں نے خطاب فرمایا ان میں امیر حلقہ مشرقی یوپی جماعت اسلامی جناب مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی، استاد جامعہ جناب مولانا نظام الدین اصلاحی اور ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی شامل ہیں۔ ان حضرات نے تمام مسلمانان ہند کو بنیادی اصولوں کے اشتراک کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر آنے کا پیغام دیا اور ایمان و عمل کا پیکر اور سراپا خیر بن کر جاوداں مثال پیش کرنے کی دعوت دی۔

آخر میں منظور کردہ قراردادوں میں باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے، علماء کرام کے مقام اور وقار کو بلند کرنے اور مدارس دینیہ کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتے ہوئے انہیں مزید قابل عمل بنانے پر زور دیا گیا اور کلمات تشکر کے ساتھ اختتام اجلاس کا اعلان کیا گیا۔

***

Intimate Web Solutions
Our services:
• Website designing • Website development
• E-Commerce Website • Dynamic Website
• Flash Website • Static Website • Domain booking
• Hosting space • Online Payment Gateway
Contact us for more details:
Musab Rafiq
A-58/3, Shahin Bagh, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mobile: 9899400404
Email: intimate.ws@gmail.com
www.iws.net.in

قراردادیں

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا آٹھواں اجلاس عام ۳۰/۳۱ راکتوبر ۲۰۰۹ء کو جامعۃ الفلاح میں منعقد ہوا۔ ۳۰ راکتوبر کو فلاحی برادران کی تعارفی و جائزہ نشستیں ہوئیں۔ انجمن کے امور و مسائل پر کھلے ذہن و دماغ کے ساتھ تبادلہ خیال ہوا اور ۳۱ راکتوبر کو انجمن کے زیر اہتمام مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں علماء کا کردار کے موضوع پر سمینار منعقد ہوا۔ اس سمینار میں فکری و مذہبی، سیاسی و معاشرتی شیرازہ بندی پر باوقار اہل علم نے اپنے خیالات پیش کئے۔ اجلاس کے اختتام پر درج ذیل قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔

۱۔ داخلی استحکام

انجمن طلبہ قدیم کا یہ اجلاس فلاحی برادران کے درمیان ربط و تعلق کو مستحکم اور مضبوط بنانے کو اولین ترجیح دیتا ہے۔ اجلاس کا احساس ہے کہ ہر سطح پر ملت کے اندر اتحاد و یگانگت کی فضا کی شدید ضرورت ہے۔ علماء، دانشوران اور دینی جماعتوں کو خاص اس جانب توجہ دینی چاہئے۔ ہر سطح پر فضا کی استواری، فکری ہم آہنگی اور باہم تال میل کے قیام کے لئے منصوبہ بند کوشش ہونی چاہئے۔ اس عموم کے تحت انجمن سب سے پہلے اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت کی کوشش کرے گی۔ پھر درجہ بدرجہ ان تمام افراد اور اداروں کے اندر اس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے گی کیوں کہ فی الواقع ملت کا انتشار دراصل اس کے گوناگوں داخلی امراض اور بیرونی ریشہ دوانیوں کا شاخسانہ ہے۔ بڑی باریک بینی اور گہرائی سے جائزہ لے کر حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کرتے ہوئے داخلی استحکام اور اتحاد و یگانگت کے لئے سنجیدہ کوشش کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اجلاس کا عمومی احساس ہے کہ عام طور پر خود پسندی، نفسانیت اور باہمی بغاوت جیسے مہلک عوامل کے تحت ہی اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ سمینار کی نظر میں اختلافات کی بہت مضبوط بنیادیں نہیں ہیں اس کے برعکس اتحاد و یگانگت اور باہمی تال میل کے لئے معقول اور وافر اسباب ہر سطح پر موجود ہیں مگر ان کی جانب توجہ کم ہوتی ہے۔ انجمن کا یہ اجلاس تمام مسلمانوں سے عمومی طور پر اور ان حضرات سے بطور خاص درخواست کرتا ہے جو اخلاص و للہیت، خوشنودی رب اور رضائے الٰہی کے حصول پر یقین رکھتے ہیں کہ بلا تاخیر خوشگوار فضا کی تعمیر کے لئے شعوری جدوجہد کریں کیوں کہ "یہ طبقہ بھی خوشگوار ماحول میں باہمی اعتماد کی فضا بنانے میں ناکام رہا تو یہ ملت کا ایسا ناسور ہوگا کہ

اٹھانے اور آگے بڑھنے کے سارے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ انجمن کا یہ اجلاس اپنے ان بزرگوں اور بھائیوں کی قدر کرتا ہے اور تہہ دل سے ان کا مشکور ہے جنہوں نے انجمن کی خیر خواہی کے جذبے سے فضا کی سازگاری اور وابستگان انجمن کی بنیان مرصوص بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے اور مسلسل اس رخ پر اپنا رول ادا کرتے جا رہے ہیں اور انجمن کا یہ اجلاس ایسے عناصر کو مسترد کرتا ہے جن کے طرز عمل سے انتشار و افتراق پیدا ہوا اور باہمی یگانگت کی فضا متاثر ہو ساتھ ہی ایسے عناصر کو ان کی غلط روی کے نتیجہ میں دنیوی و اخروی خسارہ سے متنبہ کرتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں استعمال کریں۔

۲. علماء کا مقام

یہ سمینار مسلمانان ہند کے درمیان علماء کرام کے طبقہ کو اہمیت کا حامل قرار دیتا ہے۔ سمینار کی نظر میں چونکہ مسلمانان ہند اب بھی علماء کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کا احترام کرتے ہیں ان کی باتوں پر توجہ دیتے ہیں لہذا علماء کے لئے اس نازک مقام و مرتبہ کا عرفان بہت ضروری ہے۔ مسلمانوں کے درمیان ان کی یہ قدر و منزلت متقاضی ہے کہ وہ رہنمائی و قیادت کا فریضہ انجام دیں، دوسری طرف نام نہاد علماء کا ایک عنصر ایسا بھی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کو ایسے راستے پر ڈالنا چاہتا ہے جس سے انتشار و افتراق نہ صرف برقرار رہے بلکہ روز بروز اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ یہ سمینار ایسے عناصر سے مسلمانوں کو ہوشیار رہنے کی اپیل کرتا ہے۔

انجمن طلبہ قدیم کا یہ سمینار شدت وقت سے حالات کے اس تقاضہ کی جانب عوام الناس اور بالخصوص طبقہ علماء کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں۔ ملت کی مثبت تعمیر و ترقی، اصلاح بین المسلمین اور اتحاد و یگانگت کی جانب متوجہ ہوں اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے حتی المقدور اپنی قوتیں اور صلاحیتیں صرف کریں۔

یہ سمینار کسی مخصوص مدرسے سے فارغ التحصیل ہی کو علماء کے زمرے میں نہیں شمار کرتا ہے بلکہ سمینار کی نظر میں وہ سارے لوگ طبقہ علماء میں آتے ہیں جن کی نظر براہ راست قرآن و سنت پر ہو اور حالات زمانہ پر ان کا انطباق اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا سلیقہ جانتے ہوں۔ سمینار کی نظر میں مدارس اور علماء کے سلسلے میں پھیلائی جانے والی تصویر کے غلط رخ کو غیر حقیقت پسندانہ اور منفی جذبات کا مظہر قرار دیتا ہے۔ برائے نام حقائق پر پروپیگنڈہ کی ملمع سازی کے ذریعہ علماء کے ذریعہ علماء کی تصویر کشی کسی طرح درست نہیں ہے ساتھ ہی علماء سے بھی درخواست کرتا ہے کہ گہرائی سے اپنا جائزہ لے کر جہاں اور جس انداز کی بھی نامناسب باتیں ان کے اندر پائی جاتی ہوں ان کے ازالہ کی جانب توجہ دیں۔

۳. ملت کی شیرازہ بندی اور علماء

سمینار کی نظر میں ملت اسلامیہ ہند کی شیرازہ بندی پر توجہ کی سخت ضرورت ہے۔ اس عمل خیر میں مسلم سماج کے ہر طبقہ کو اپنا مثبت کردار ادا کرنا چاہئے۔ بطور خاص سمینار کا احساس ہے کہ علماء امت مسلمانان ہند کی شیرازہ بندی میں اہم کردار ادا کرنے کے موقف میں ہیں۔

بلاشبہ مسلمانوں میں فقہی، مسلکی، فکری و مذہبی اعتبار سے مختلف جماعات اور گروہ موجود ہیں البتہ ان مسالک و افکار کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اختلافات میں اتحاد کی راہیں نہ نکالی جا سکیں۔ اگر قرآن و سنت ثابتہ پر توجہ دی جائے تو نہ صرف اختلافات کی ماہیت میں تبدیلی واقع ہوگی بلکہ مسلمانوں میں وسیع النظری، فکری بالیدگی، تحمل، برداشت اور ایک دوسرے کے لئے رواداری کے جذبات فروغ پائیں گے۔ سمینار اس محاذ پر علماء دین کو مکلف قرار دیتا ہے کہ خاص طور پر مسلمانان ہند کی مذہبی شیرازہ بندی میں اپنا موثر کردار ادا کریں۔ اسی طرح سماجی و معاشرتی پہلو سے آج مسلمان ذات برادری کے خانوں میں بٹے ہوئے ہیں، حد بندیاں اتنی مستحکم ہیں کہ ان سے اسلامی تعلیمات کی روح متاثر ہوتی ہے اور مسلمان دیگر اقوام کی طرح اونچ نیچ کے طبقات میں منقسم ہو گئے ہیں لہذا موجودہ سماجی تقسیم اور اس کے نتائج بد کسی قیمت پر درست قرار نہیں دیے جا سکتے۔

یہ سمینار مسلمانوں میں شرف و فضل کی ایک ہی بنیاد کو واقعی تصور کرتا ہے اور وہ قرآنی ہدایت "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" ہے اس کے ماسوا جو چیزیں مروج ہیں ان کو ختم ہونا چاہئے۔ سمینار کی نظر میں موجودہ معاشرتی تقسیم کو ختم کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں کے ہر باہوش فرد پر عائد ہوتی ہے لیکن چونکہ علماء کو کسی حد تک یک گونہ اختیار حاصل ہے لہذا ان کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ آگے بڑھ کر قولاً و عملاً اس بیماری کا علاج کرنے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کریں۔

سمینار کی نظر میں سیاسی میدان میں بھی علماء کو قائدانہ رول ادا کرنا چاہئے کیوں کہ اسلام مکمل نظام حیات ہے اور سیاست اس کا جز لاینفک ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بیشتر علماء کی موجودہ ذہنی و فکری ساخت سیاسی رہنمائی کی متحمل نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کو ایک کل کے طور پر دیکھنے اور اس پس منظر میں دین کو سمجھنے میں اکثر علماء ابھی پیچھے ہیں۔ سمینار کی خواہش ہے کہ علماء کرام دین کا کما حقہ عرفان حاصل کریں ساتھ ہی حالات زمانہ سے گہری واقفیت بہم پہنچائیں۔ پھر سیاست کے محاذ پر بھی ضرور رہنمایانہ رول ادا کریں۔ لیکن فی الحال سیاسی محاذ پر علماء کا کردار نہایت تکلیف دہ ہے۔ سمینار اس حقیقت سے علماء کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ میدان سیاست کے بازیگران سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ان کو اپنا زر خرید غلام تصور کرتے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے آلۂ

ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ صورت حال تشویشناک ہے۔ انتخابات کے مواقع پر اگر ہمارے علماء چند سکوں کے عوض اپنی وفاداریاں یا اپنی تائید کسی کے حوالہ کرنے لگیں تو اس سے زیادہ گری ہوئی بات کیا ہو سکتی ہے۔ سمینار پوری تیاری واہتمام کے ساتھ علماء کرام کو میدان سیاست میں بھی مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اپنے انفرادی واجتماعی رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے بے گناہوں بالخصوص پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں پر جو مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور ناحق قید وبند کی صعوبتوں سے گزارا جارہا ہے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔

4. مدارس دینیہ

یہ سمینار دینی مدارس کو اہمیت کا حامل قرار دیتا ہے اور مدارس کے ذریعہ انجام پانے والی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ یہ مدارس اپنی معنویت وافادیت میں بہتری لانے کے لئے شعوری کوشش کریں گے۔ مدارس اسلامیہ کی یہ حیثیت و مقام ہے کہ جس کے سبب دوست ودشمن سب کی نظریں مدارس پر لگی ہوئی ہیں۔ خیر خواہانہ لب ولہجہ میں بظاہر مدارس کے حق میں سرکاری وغیر سرکاری سطح پر وقتاً فوقتاً تجاویز ومشورے سامنے آتے رہتے ہیں اور اہل مدارس کو باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی دکھائی ہوئی راہ کو اختیار کرلیا جائے۔ سمینار مدارس کی اصلاح وترقی کے ان جذبات ونظریات کی نفی کرتا ہے جن کے اندر اخلاص وخیر خواہی کے بجائے بعض دیگر جذبات وعوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ البتہ ان تجاویز کی قدر کرتا ہے جو مبنی بر اخلاص اور خیر خواہانہ جذبات کے تحت پیش کی جاتی ہیں۔

یہ سمینار مدارس کے موجودہ نظام ونصاب میں مضبوط بنیادوں پر اصلاح کی ضرورت محسوس کرتا ہے البتہ خواہ مخواہ اخباری مباحث اور سرکاری مداخلت کو غیر مفید اور ضرر رساں تصور کرتا ہے۔ مدارس کے نظام ونصاب میں اصلاح وتبدیلی کا صحیح وموثر طریقہ یہ ہے کہ خود ارباب مدارس وقتاً فوقتاً بیٹھ کر اپنے حالات کا جائزہ لیتے رہیں اور صحیح اسپرٹ اور ایک تدریج وتسلسل کے ساتھ مدارس کی معنویت وافادیت کو فزوں تر کرنے کے لئے کوشاں رہیں۔ یہ سمینار ارباب مدارس پر اعتماد کا اظہار کرتا ہے اور ان کی مومنانہ بصیرت سے توقع رکھتا ہے کہ مدارس کے نظام ونصاب میں مفید ونتیجہ خیز تبدیلی کا عمل جاری رکھیں گے۔ اسلامی دانش گاہوں کا ایک تاریخی تسلسل ہے۔ ذمہ داران مدارس کا اس تسلسل کے آئینے میں اپنے آج کو دیکھنا اور بہتر کل کے لئے ٹھوس عملی اقدامات کرنا چاہئے۔ یہ سمینار سرکاری سطح پر مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام اور تمام مدارس میں اس کے براہ راست عمل ودخل کو غیر ضروری اور مشکوک تصور کرتا ہے کیوں کہ

اب تک جن مدارس کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے اس کا انجام اور اس کی کارکردگی ناقابل اطمینان بلکہ کسی درجہ میں نقصان دہ رہی ہے۔ البتہ اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ حکومت کی مراعات اور رفاہی وتعلیمی اسکیموں سے اپنے معیار اور اصولوں کے تحت استفادہ کا راستہ کھولا جائے۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت رافع بن خدیجؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ:

کون سی کمائی زیادہ پاک اور اچھی ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

آدمی کا اپنے ہاتھ سے کوئی کام کرنا اور تجارت، جو پاکبازی کے ساتھ ہو۔

(مسند احمد)

Wisth Best Compliments from:

یاور انٹرنیشنل

Yawar International

Approoved by Ministry of Labour, Govt. of India
Licence No. 1749/DE/PART/300/3/3193/91

Address:
2/3, Jullena Commercial Complex ,
Behind Ali Baba Restaurant, Okhla Road
New Delhi - 110025 (INDIA)
Tel.: 26833702 Tel./Fax: 26914348
e-mail: yawarint@yahoo.com

جامعہ کے لیل و نہار

عبدالرقیب فلاحی

۱۔ دو روزہ تربیتی پروگرام

الحمدللہ جامعہ اپنے ارتقائی سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے، چنانچہ ہر سال تعلیمی و تربیتی فرائض و واجبات کے نو بہ نو تقاضے سامنے آتے ہیں جن کی تکمیل کے لیے نت نئی کوششیں ہوتی رہتی ہیں، انھیں تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے کلیۃ الدعوۃ جامعۃ الفلاح میں طلبۂ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض کے زیر اہتمام دو روزہ تربیتی پروگرام بتاریخ ۹/۸ اکتوبر ۲۰۰۹ منعقد ہوا جس کا مرکزی عنوان "قرآن مجید - کتاب ہدایت اور شعار "ہدی للناس" تھا۔ اس پروگرام میں جامعہ کے جملہ اساتذہ و کارکنان اور طلبہ فضیلت نے شرکت کی۔

پروگرام کا آغاز عبدالرقیب فلاحی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا، افتتاحی کلمات مہتمم تعلیم و تربیت محترم مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی صاحب نے پیش فرمائے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ افادیت سے بھرپور پروگرام ہمارے ان فلاحی طلبہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض میں زیر تعلیم ہیں۔ امسال جامعہ میں کئی پروگرام انگی کوششوں کے نتیجے میں منعقد کیے گئے جو انتہائی مفید ثابت ہوئے جنکی افادیت کا اندازہ شرکاء کے تاثرات کے ذریعے ہوا۔

اس کے بعد مولانا انیس احمد مدنی صاحب استاد جامعہ نے "قرآن مجید کا تعارف - قرآن کی زبانی" کے عنوان پر ایک قیمتی محاضرہ پیش کیا۔ قرآن مجید کی متعدد آیات کی روشنی میں قرآن مجید کا مدلل تعارف پیش کیا۔

اس کے بعد استاد جامعہ مولانا اعجاز احمد مکی صاحب نے "قرآن مجید کا اعجاز" کے عنوان پر بالتفصیل روشنی ڈالی۔ اس سیشن کی صدارت استاد محترم مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب نے کی آپ نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ قرآن مجید کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے دنیا و آخرت دونوں کو سنوارنے کا سلیقہ سکھایا، قرآن مجید میں انسانی زندگی کے تمام مسائل خواہ معاشی ہوں یا سیاسی، اجتماعی ہوں یا انفرادی سے بحث کی گئی ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا اعجازی پہلو ہے۔

دوسرے اجلاس میں محترم مولانا محمد عمران فلاحی صاحب نے "احکام وراثت قرآن کی روشنی

میں" کے عنوان پر مفصل اظہار خیال فرمایا اور اس بات پر زور دیا کہ قرآن مجید کے احکام وراثت کو عملی جامہ پہنایا جائے اور ہر شخص تقسیم ترکہ کے وقت قرآنی اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھے۔

تیسرے اجلاس میں محترم مولانا محمد اسماعیل فلاحی صاحب استاد تفسیر نے "مقاصد نزول قرآن" کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد تزکیہ باطن ہے، جس کا لغوی مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا اور نقصاندہ چیزوں کو نکال کر نشو و نما دینا اور پروان چڑھانا ہے اور اس کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ نفس کو باطنی نجاستوں، شرک، کفر، نفاق اور دیگر عقائد فاسدہ سے پاک کر کے اس کے اندر تقویٰ اور خدا ترسی پیدا کی جائے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت فرما رہے محترم مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب نے فرمایا کہ قرآن مجید جو کتاب ہدایت ہے وہ ہماری فطری ضرورت کے عین مطابق ہے۔ بلاشبہ یہ تمام انسانوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے لیکن اس سے بھرپور رہنمائی وہی حاصل کر سکتا ہے جو متقی و پرہیزگار ہو اور تقویٰ دراصل خوف اور منعم کے شعور و احساس کا نام ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ قرآن سے ہمارا تعلق عملی ہونا چاہئے۔

۲۔ ماہر قرآنیات محترم راؤ عرفان احمد صاحب کی جامعہ میں آمد

۲۲ نومبر ۲۰۰۹ء بروز شنبہ مولانا ابواللیث ہال میں معزز مہمان نے "قرآن مجید کیسے پڑھیں؟" کے عنوان پر شعبہ اعلیٰ کے طلبہ و اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قرآن مجید پڑھنے سے پہلے انسان کو کلی طور پر خالی الذہن ہونا چاہئے، خالی الذہن کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے شعور یا لاشعور میں کوئی چیز پہلے سے متعین نہیں ہونی چاہئے۔ انسانی ذہن ایک کتاب کے مانند ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کو جواب کی جگہ سوال بننا چاہئے۔ قرآن مجید کو تسلسل کے ساتھ سمجھ کر پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہئے اور اس کے لئے اسلاف کے اقوال کو سامنے رکھا جائے۔

معزز مہمان کی ایک مخصوص نشست بعد نماز مغرب مہمان خانہ میں مخصوص اساتذہ کرام کے ساتھ ہوئی جس میں "قرآن کا نصاب کیسا ہو؟" اور "معلمین قرآن کیسے تیار ہوں؟" کے عنوان پر تبادلہ خیال ہوا۔ اس نشست میں ادارہ ناظم جامعہ نے شعبہ اعلیٰ کے قرآنی نصاب کی تفصیل پیش فرمائی۔ اس کے بعد مولانا محمد اسماعیل فلاحی صاحب نے قرآن پڑھانے کے طریقے پر مفصل روشنی ڈالی۔ معزز مہمان نے اپنی گفتگو کے دوران قرآن فہمی کے سلسلے میں فرمایا کہ کسی سورہ کے لئے مخصوص الفاظ میں عمود اور مرکزی مضمون کو محدود کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ مجموعی سورہ کے لئے ایسی باتیں تلاش کی جانی چاہئیں جو اہمیت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور انہی کی روشنی میں مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

محترم موصوف نے ایک تجویز یہ بھی پیش کی کہ جامعۃ الفلاح میں ایک ایسی عالمی قرآنی کانفرنس منعقد کی جائے جس میں تمام مکاتب فکر کے علماء کو مدعو کیا جائے اور ان سے استفادہ کی شکل پیدا کی جائے۔

۳. جمعیۃ الطلبہ کے نو منتخب ذمہ داران کا افتتاحی پروگرام :

۱۹/نومبر ۲۰۰۹ء بروز جمعرات ابو اللیث ہال میں جمعیۃ الطلبہ کا افتتاحی پروگرام مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب ڈائریکٹر کلیۃ الدعوۃ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز ابن اسمٰعیل متعلم عربی اول کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، عاشق احمد نے بارگاہ نبوت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا اس کے بعد سابق ذمہ داران جمعیۃ نے اپنے تجربات اور تاثرات پیش کئے اور اپنے تاثرات میں سب سے پہلے طلبہ کے تعاون پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد نئے ذمہ داران جمعیۃ نے جمعیۃ الطلبہ کے پلیٹ فارم سے مقاصد جامعہ کو بروئے کار لانے کے لئے عملی کوشش وجد وجہد کرنے کا عزم کیا اور اس کو مفید سے مفید تر بنانے کے لئے اساتذہ کرام سے مزید تعاون کی درخواست کی۔

مولانا محمد عمران فلاحی صاحب (صدر مدرس) نے نصیحت آمیز کلمات پیش کرتے ہوئے سابق اور نو منتخب ذمہ داران کے مابین باہمی تعاون پر زور دیا اور طلبہ کو پوری دلچسپی کے ساتھ حصہ لینے کی تلقین کی۔

صدر مجلس محترم مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ تربیت کے لئے اندرونی طلب ضروری ہے۔ جب تک طلبہ اپنے طور پر کچھ بننے کے لئے تیار نہ ہو جائیں ان کو بنانے کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی۔

نو منتخب ذمہ داران جمعیۃ الطلبہ

۱۔ سکریٹری	محمد اسلام	ایم پی
۲۔ لائبریرین	ندیم احمد	گورکھپور
۳۔ معتمد رسائل وجرائد	عبد الملک طاہر	اعظم گڑھ
۴۔ معتمد تحریر	عتیق الرحمٰن	ہریانہ
۵۔ معتمد خطابت	محمد عالم نثار	دہلی
۶۔ معتمد کھیل	شاداب احمد	اعظم گڑھ

۴. جامعہ میں فلاحی ووکیشنل ٹریننگ سنٹر کا قیام :

یہ خبر انتہائی باعث مسرت ہے کہ بتاریخ ۱۱/فروری ۲۰۱۰ء بروز جمعرات ایک اہم شعبہ فلاح

ووکیشنل ٹریننگ سنٹر کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تلاوت قرآن مجید کے بعد خطبہ استقبالیہ میں ناظم جامعہ نے کہا کہ جامعۃ الفلاح کا قیام بہت ہی واضح مقاصد کے تحت عمل میں آیا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد ہے ملت کے بچے اور بچیوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا نیز ان کو دیگر پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا حامل بنانا، اسی مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سنٹر کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جس میں (۱) کمپیوٹر (۲) ٹیلرنگ، کٹنگ و ڈیزائننگ (۳) پلمبنگ (۴) الیکٹرک (۵) ریفریجریشن اور ایرکنڈیشننگ سے متعلق کورسیز شروع ہو چکے ہیں۔

اس افتتاحی تقریب میں عرب مہمان ڈاکٹر توفیق عبد العزیز السویلم، چیرمین گلف بورڈ کے ہمراہ ڈاکٹر افتخار احمد پرنسپل PG شبلی کالج اعظم گڑھ، جناب مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند یوپی مشرقی، برادر محمد طلحہ رنگیل کوآرڈینیٹر ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن نئی دہلی بطور خصوصی مہمان کے شریک رہے۔ اس سنٹر کا قیام ہیومن ویلفیر فاؤنڈیشن نئی دہلی کے اشتراک سے عمل میں آیا۔

۵. اظہار تعزیت :

یہ اطلاع دیتے ہوئے ہمیں بے حد تکلیف ہو رہی ہے کہ جامعہ کی مجلس شوریٰ کے قدیم رکن و سابق خازن جناب شیخ منیر احمد صاحب کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم جامعہ کے بہی خواہوں میں سے تھے اور جامعہ کی تعمیر و ترقی میں آپ کا اہم کردار تھا۔

ابھی یہ زخم مندمل نہ ہو سکا تھا کہ کلیۃ البنات کی ایک انتہائی قدیم معلمہ و دیرینہ خادمہ جو خشت اول سے لے کر تادم آخر جامعہ سے منسلک رہیں سیدہ مشفقہ وقار صاحبہ اس دار فانی سے بتاریخ ۲۶/فروری ۲۰۱۰ء صبح ۴۵:۵ منٹ پر دار البقاء کی طرف کوچ کر گئیں، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

کئی برس تک انہوں نے صدر معلمہ کلیۃ البنات کی حیثیت سے خدمت انجام دی، ایک طویل عرصے سے علیل تھیں۔ ہفتہ عشرہ قبل ہی ان کے رفیق حیات جناب وقار احمد صاحب کے انتقال کا سانحہ پیش آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم و مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

۶. جامعہ میں امتحان ششماہی:

۲/مارچ تا ۹/مارچ ۲۰۱۰ء جامعہ میں ششماہی امتحان ہوا، اس کے بعد ۱۰/مارچ تا یکم اپریل ۲۰۱۰ء تعطیل کردی گئی۔

☆☆☆

ایک اہم پیشکش

اسلام ایک خدائی نظام حیات (اُردو)

راجیند رنارائن لعل، ایم اے (تاریخ و سنسکرت)

☆صفحات 80 ☆سائز 23x36/16 ☆قیمت 25.00

ہندی میں شائع اس کتاب کی مقبولیت وافادیت کو دیکھتے ہوئے اس کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ اس کتاب میں حق پسند مصنف نے مذہب کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالنے کے بعد ہندو دھرم، عیسائی دھرم اور اسلام کا نہایت جامع اور حقیقت پسندانہ تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا نہایت مدلل انداز میں ازالہ کیا ہے، جیسے:

کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟ کافر لفظ کا مطلب، خاندان کے اندر شادی بیاہ، اسلام اور غلامی، مردے کو جلانا مناسب ہے یا دفن کرنا؟ تناسخ یا آواگمن، جزیہ، تعداد ازدواج یا ایک سے زائد بیویاں رکھنا، پردہ، ذبیحہ گائے، اسلامی حکومت، مسلمان علیحدگی پسند، مسلمان غیر ملکی۔

اس کتاب کے بارے میں خود راجیند رنارائن لعل فرماتے ہیں:

''مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ اسلام کے وہ ناقدین جو پہلے سے اس کے بارے میں غلط رائے قائم کئے بیٹھے ہیں، اس کتاب کے ذریعے سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اپنے غلط خیالات کو ترک کر دیں گے۔''

ہماری دیگر مطبوعات کے علاوہ دیگر پبلشرز کی اسلامی کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ دعوتی کام کرنے والوں اور تاجر حضرات کو خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔

مدھر سندیش سنگم

E-20، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25 فون: 26953327، فیکس: 23276741

تعارف واپیل جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں

بھارت بھاری سدھارتھ نگر، یوپی 272191

Mobile: 09450567797, 09451097177, 05545209287

جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں شمال مشرقی یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر ڈمریا گنج قصبے کے جنوب میں پرسکون وادی میں واقع ہے۔ یہ ایک ایسی دینی درسگاہ ہے جو دینی وعصری علوم کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ نیپال کے طلبہ بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں کے فارغین دینی وعصری علوم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نہ صرف ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں داخلہ لے سکتے ہیں بلکہ خلیجی ممالک کی یونیورسٹیوں کے دروازے بھی ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ جامعہ کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی بنیادوں پر تربیت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔

خصوصیات:

☆تعلیمی سیشن: شوال المکرم تا شعبان المعظم ☆شعبۂ ابتدائی: درجہ اطفال تا پنجم ☆شعبۂ ثانوی: درجہ ششم تا ہشتم ☆شعبۂ عالی: عربی اول تا پنجم ☆شعبۂ حفظ: مدت تعلیم ایک سال ☆فاصلاتی تعلیم: اسٹڈی سینٹر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔ بی اے، بی ایس سی، بی کام، ایم اے۔ ☆اسٹڈی سینٹر NIOS دہلی، ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ ☆اسٹڈی سینٹر ڈپلومہ ان اردو لینگویج ☆ڈپلومہ ان فنکشنل عربک NCPUL نئی دہلی۔

آئینہ جامعہ:

☆تعداد طلبہ وطالبات: 1065 ☆ہاسٹل میں طلبہ: 250 ☆اساتذہ: 32 ☆ملازمین: 12

☆فارغین عالمیت: 155 ☆مستفیدین شعبۂ حفظ: 170 ☆مستفیدین آئی ٹی آئی: 80

☆مستفیدین فاصلاتی تعلیم MANUU: 217 ☆NIOS: 120 ☆مستفیدین ڈپلومہ ان اردو لینگویج: 117

☆مستفیدین ڈپلومہ ان فنکشنل عربک: 240 ☆کل مستفیدین طلبہ وطالبات ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ: 4124

ادارہ کی آمدنی اور خرچ: مسلم عوام کے چندے، صدقات، عطیات وغیرہ

☆یتیم و نادار طلبہ کی مکمل کفالت ادارہ کرتا ہے ☆سالانہ ڈول کا خرچ تقریباً -/Rs. 633370

☆ **ادارہ کا سالانہ خرچ: 28 لاکھ سے زائد**

تمام اہل خیر ودردمندان ملت سے درخواست ہے کہ ادارے کا ہر ممکن تعاون فرما کر اللہ سے اجر عظیم کے مستحق ہوں

تعاون کی شکلیں:

☆ایک نادار طالب علم کا سالانہ وظیفہ: -/Rs. 8,000 ☆ایک یتیم کی مکمل کفالت: -/Rs. 9,000

☆ایک استاذ کی ماہانہ تنخواہ: -/Rs. 5,000 ☆تمام اساتذہ کی ایک ماہ کی تنخواہ: -/Rs. 1,56,000

چیک/ڈرافٹ پر صرف لکھیں: **Jamia Misbahul Uloom**

A/C No. 30290663653

SBI, Branch Dumariya Ganj, Code: (1250)

E-mail: jamiamisbah@gmail.com, website: misbahululoom.com

حي على الصلاة

MANPOWER CONSULTANT
IMPORTERS & EXPORTERS

Jamal EXPORTS

REGN. NO. 002064/BOM/PER/1000+/2%/3530/92

22 ZIA APARTMENT, 264 BELLASIS RD.
MUMBAI - 400 008. (INDIA)
TEL.: 0091-22-2309 2286, 2306 0092, 2300 5204
FAX: 0091-22-2300 1665, Dir: 23010378
E-mail: admin@jamalexports.in
MOB.: 0091-9821032582 / 9969011444
SAUDI MOB.: 0556991550

DELHI
*99/2, 2nd Floor, Opp. Escort Heart Hospital
Sarai Jaleena, New Delhi - 110025
Tel.: 011-2684 2682 / 2692 6879
Fax: 2684 2681 Mob.: 99583 33976

LUCKNOW
Flat 7, 1st Flr. Dilkusha Plaza
Opp. Meranan Hotel, Hussain Ganj, Lucknow
Tel.: 0522-2639423 Fax: 4072288 Mob.: 09307226192

وبالوالدين احسانا

MUJTABA & SIDDIQUI
Plots Consultant

N.A. Lay-out Sanction Plots Available at Aurangabad. Maharashtra

M.S. PARK
Plot No. 30, Savangi, Aurangabad,
on Jalgaon Highway

M.S. HILL
on Jalgaon Highway,
Aurangabad

Contact
Mujtaba Farooq : # +919810499096
Saleem Siddiqui : # +919890028528

Head Office: Khaled Tower, Kat Kat Gate, Aurangabad Tel.: 0240-2311213

جامعۃ الصالحات بانسی

سدھارتھ نگر، یوپی-۲۷۲۱۵۳

جامعہ کے اغراض و مقاصد

ایسی خواتین تیار کرنا

☆ جو قرآن وسنت کا گہرا علم اور صحیح دینی بصیرت رکھتی ہوں ☆ جن کی نظر وقت کے اہم مسائل پر ہو
☆ جو غیر اسلامی افکار ونظریات سے بخوبی واقف ہوں ☆ جو اسلامی اخلاق وکردار کی حامل ہوں
☆ جن میں احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کا مخلصانہ جذبہ ہو ☆ جو گروہی، جماعتی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہوکر وسعت قلب ونظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح وتعمیر کا فریضہ انجام دے سکیں
☆ ایسا نصاب تعلیم زیر عمل لانا جس میں دینی ودنیوی علوم کا بہترین امتزاج ہو

خصوصیات:

☆ قرآن وحدیث اور عربی زبان کی اعلیٰ معیاری تعلیم فضیلت تک ☆ نصاب تعلیم میں دینی وعصری علوم کا حسین امتزاج ☆ طالبات کی ہمہ جہت تربیت اور داعیانہ صلاحیت کی تیاری پر زور ☆ امور خانہ داری اور دستکاری میں مہارت ☆ عربی انگلش اسپیکنگ کورس ☆ کیلی گرافی کی مشق

تعاون کی شکلیں

☆ ایک طالبہ کا سالانہ وظیفہ	Rs. 7,000.00
☆ ایک استاذ کی ماہانہ تنخواہ	Rs. 4,000.00
☆ ایک کمپیوٹر کی خریداری	Rs. 52,000.00
☆ تمام اساتذہ کی ایک ماہ کی تنخواہ	Rs. 1,03,000.00

☆ مذکورہ بالا منصوبوں میں سے کسی ایک منصوبے کی تکمیل ☆ خواہش مند طالبات کو یہاں داخلہ کی ترغیب دینا

چیک / ڈرافٹ پر صرف **Jameatus Salehat** لکھیں

A/C No. 31033385731

State Bank of India (SBI), Branch BANSI

Jameatus Salehat Bansi
Distt. Siddharth Nagar, U.P. INDIA - 272153
Phone: 05545-255271, 256371